DUE DATE

Cl. No. ________ *Acc. No.* ________

Late Fine Ordinary books **25 p.** per day, Text Book **Re. 1/-** per day, Over night book **Re. 1/-** per day.




DRINK
HAMDARD DAWAKHANA KARACHI
روح افزا


اورس
دنیا کی بہترین واٹر پروف گھڑیوں میں سے ہے
حسین ترین ڈیزائنوں میں ہمارے یہاں سے
ہر وقت مل سکتی ہے۔
ORIS
تقسیم کنندہ:-
الانا واچ کمپنی
لکشمی بلڈنگ۔ بندر روڈ۔ کراچی
فون نمبر ۲۸۵۰
شاخیں:- لاہور اور ڈھاکہ

جاری شدہ ۱۹۴۵ء

مدیر
صہبا لکھنوی

خاص نمبر
ستمبر ۱۹۵۲ء

کراچی

۱۱، ۱۲

افکار

زرِ سالانہ

بھارت میں		پاکستان میں
سات روپے آٹھ آنے		چھ روپے آٹھ آنے
	قیمت خاص نمبر	
دو روپے		ایک روپیہ آٹھ آنے

افکار
۹
کراچی

مقامِ اشاعت:۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی



تصاویر

طویل مختصر نظمیں، رباعیات، گیت۔

غزلیں

طویل مختصر افسانے، طنزیے، خاکے۔

دیس دیس کا ادب

مقالے، تبصرے، فلم

اشاریہ

—— اور افکار آج چھ سال کا ہو گیا۔ چھ سال بظاہر پلک جھپکتے بیت گئے — لیکن ان چھ سالوں میں سچ پوچھئے تو زندگی نے کئی کروٹیں لیں، کئی ادبی موڑ آئے — آئے اور گذر گئے

—— اور افکار ملک کے زندہ فنکاروں کے تعاون سے وقت کی ہر کروٹ اور زندگی کے ہر موڑ پر زبان و ادب کے نئے تقاضوں کو پورا کرتا رہا۔

—— اور آج چھٹی سالگرہ پر افکار اپنا چوتھا خاص نمبر پیش کر رہا ہے۔ اس میں شامل ہونیوالے تمام فنکاروں نے زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کی کس حد تک نمائندگی کی ہے —؟ اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

افسوس کہ کئی منتخب چیزیں تنگ دامانی کے باعث خاص نمبر میں شامل ہونے سے رہ گئیں جو اگلے شماروں میں پیش کی جائیں گی۔

—— صہبا لکھنوی

۲۱/۵/۵۲ء

رنگ روپ

فراق گورکھپوری

غزل گوئی کا روایتی اسلوب تو ہمارے ہاں ولی سے نئے شعراء تک خفیف تغیرات کے ساتھ اسی صورت میں چلا آرہا ہے جس طرح ہم نے فارسی کے متاخرین شعراء سے لیا تھا لیکن گذشتہ دو تین صدیوں میں غزل جیسی صنف میں بھی مجتہدین پیدا ہوتے رہے ہیں، اور ہماری صدی کے مجتہد فراق گورکھپوری ہیں۔

دراِن الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں لیکن ان کا اردو کا ذوق حد درجہ پاکیزہ ہے وہ غزل تو کہتے ہی ہیں اور اسے انھوں نے اپنی میٹھی زبان اور گمبھیر خیالات سے روپ بھی بہت سجیلا عطا کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ بلند پایہ نقاد بھی ہیں۔ نظموں اور تنقیدوں میں ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے اور انھوں نے اردو ادب کے مختلف ادوار کا سماجی پس منظر واضح کرنے میں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی کاوش کی ہے۔

غزل میں انھوں نے ہندی کے ایسے میٹھے اور رسیلے الفاظ داخل کئے جو اس سے پہلے اردو میں مستعمل نہیں تھے اور اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے بغیر اردو زبان لنجی اور ادھوری تھی۔ فراق نظمیں بھی کہتے ہیں اور ان کی نظموں کا رنگ ان کی غزلوں سے بہت مختلف ہے چنانچہ ان کی بعض نظمیں نظیر اکبرآبادی کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن آدھی رات جیسی نظموں میں غزل کا رچاؤ بھی ہے اور کلاسیکی شاعری کی گمبھیرتا اور گہرائی بھی، پچھلے دنوں پاکستان بننے کے بعد پہلی بار کراچی آئے تھے اور رخصت ہوتے ہوئے اپنے دیرینہ خلوص و محبت کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

شفیق الرحمٰن

ایک فرد نہیں بلکہ ایک انسٹی ٹیوشن کی حیثیت رکھتے ہیں، بے مثل افسانہ نگار رہنے کے علاوہ وہ ایک بہترین اسپورٹس مین بھی ہیں۔ کتنے ہی کھیلوں کے وہ ماہر ہیں، پیراکی، کُمّہ بازی، ٹینس میں تو انھوں نے یونیورسٹی میں اعزاز حاصل کیا اور جس کھیل سے انھیں عشق کی حد تک جنون ہے وہ کرکٹ ہے اور کرکٹ میں وہ اپنے وقت کے مشہور فاسٹ بولر تھے، ایمیچر فوٹوگرافی میں بھی انھیں کامل دستگاہ حاصل ہے۔ کتابوں پہ جان دیتے ہیں، آئینسٹائن اور اسٹیفن لیکاک ایک سی روانی سے پڑھتے ہیں، "روح اور جسم" دونوں میں یونانی ہیں۔ مشغلہ کو فروزاں رکھنا انھیں پسند ہے، ہر وہ شخص جو ان سے پہلی بار ملتا ہے، ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ پچھلے دنوں وہ "بجھاتے" کی سی سنجیدہ کہانیاں لکھتے رہے ہیں، پھر بھی ان کی رومانی ڈاک میں کوئی کمی نہیں آئی۔

شفیق الرحمٰن ایک سی روانی کے ساتھ سنجیدہ، مزاحیہ اور طنزیہ کہانیاں لکھتے ہیں، انکی قوت ایجاد، طباعی اور حسن ظرافت سے صنف قوی سے زیادہ صنف لطیف زیادہ متاثر ہے، اتنی خوبیوں کے باوجود وہ ایک ڈاکٹر ہیں پاکستان آرمی میں لفٹنٹ کرنل اور آج کل اسکاٹ لینڈ کی ایڈنبرا یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ کورس کر رہے ہیں۔

جاں نثار اختر ترقی پسند شعراء کے ہراول دستے میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، ان کی شاعری کی اٹھان نے یوں تو اس زمانے میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی جب وہ علیگڈھ میں محض طالب علم تھے انھوں نے اپنے فکر و قلم سے ہمیشہ ترقی پسند تحریک کا ہر امتحان میں ساتھ دیا ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کا سنگیت بھی ملتا ہے اور آتش و آہن کا سیلاب بھی۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ طبقاتی تضاد کی سنگین حقیقتیں بکھری نظر آتی ہیں۔ اور انھیں بڑھتی ہوئی طاقتوں کے غم دل کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نظموں کے علاوہ ان کی رباعیات میں بھی کلاسیکی شاعری کے بے مثل نمونے ملتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انکا خمیر ایک کلاسیکی اور روایتی قسم کے گھرانے سے اٹھا ہے اور یہ جاں نثار کی شاعرانہ عظمت ہے کہ انھوں زمانہ حال کی حقیقتوں کی آمیزش سے اپنے کلام کو وہ رنگ بخشا ہے کہ ہم ان کے اسلوب کو بھول کر ان کے موضوع میں کھو جاتے ہیں، سب شاعروں میں یہ بات نہیں ملتی۔ ان دنوں بمبئی میں ہیں اور فلمی دنیا سے وابستہ۔

صادق الخیری ملک کے عظیم المرتبت انشاء پرداز علامہ راشد الخیری کے چشم و چراغ ہیں اور انکا شمار بھی ملک کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز میں وہ اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے بقول شاہد احمد دہلوی ــــ "صحیح معنوں میں صادق الخیری اسی تحریک (ترقی پسند) کے ساتھ میدان ادب میں آئے"۔ دلی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے وہ ایک سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے بیشمار کہانیاں لکھی ہیں اور چونکہ فلسفہ کے ایم اے ہیں اس لئے انکی کہانیوں میں عام طور سے گہرا تفکر اور سنجیدگی پائی جاتی ہے ان کے نفسیاتی افسانوں میں ہمیں شائستگی، ہلکا پھلکا رومان اور زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر واضح اشارات ملتے ہیں۔ زندگی اور ادب میں فرار کے وہ کبھی قائل نہیں ہوئے ــــ دلی کی تباہی کے بعد کراچی آ گئے اور ملازمت قید و بند کے باوجود لکھنے پڑھنے کا کچھ نہ کچھ سلسلہ جاری ہے۔ بنت قمر، پاکستان میں لکھا ہوا ان کا تیسرا افسانہ ہے جو خاص طور پر افکار کے لئے لکھا گیا ہے، اُن سے مل کر آپ ان کے خلوص اور خوش اخلاقی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے، اس وقت تک صادق الخیری کی ۸ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

فکر تونسوی پہلے صرف شاعر تھے اب طنز نگار اور نقاد بھی ہیں، موضوع اور زبان کی بھول بھلیوں میں اسیر اس آئیڈیلسٹ شاعر کو زمانہ کے سرد و گرم نے گذشتہ چھ سات سال میں بہت کچھ سکھا دیا ہے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے تو انکی کایا ہی پلٹ دی ہے، انکا چھٹا دیا پرانے اور نئے فکر تونسوی کا سنگم ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فکر تونسوی اپنے نئے روپ میں بعض اوقات اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں اور انھوں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے فکر تونسوی کی وہ باتیں بھی تقریباً چھوڑ دی ہیں جو بہت پیاری تھیں، مثلاً زبان کی گھلاوٹ، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ چند روز کے بعد ان کے ہر دو رنگوں میں جدلیاتی فلسفے کی ترکیب پیدا ہو جائیگی اور صحیح فکر تونسوی نکھر کر سامنے آ جائیگا۔ فکر تونسوی نے بہت تلخیاں سہی ہیں، انکے سینے میں بہت داغ بھی ہیں جسکی وجہ سے انکا لہجہ کبھی بہت تیکھا بھی ہو جاتا ہے، لیکن ان کی عظمت یہ ہے کہ وہ سمجھوتہ بازی نہیں کرتے۔ ادبی مرکزوں اور ادبی قدر شناسوں سے وہ دور سہی لیکن ناسازگار فضاؤں میں بھی وہ اپنا چراغ جلائے ہیں اور امن کے لئے تو انھوں نے بالخصوص بہت کام کیا ہے اور خدا جانے اس سلسلہ میں انھوں نے کیا کچھ کھویا اور کیا کچھ پایا ہے۔ بے حد مخلص اور جاں نثار قسم کے انسان ہیں۔ اور ان دنوں دلی کی ہنگامہ پرور سرزمین میں اپنے ذوق و معیار سے قطعی مختلف رسالوں کی ایڈیٹری کر کے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔

عمل چغتائی



انشا جاگ اٹھا

کرشن چندر



نواب جعفرعلی خاں
اثر لکھنوی



شفیق الرحمان





احمد ندیم قاسمی

صادق الخیری





ڈاکٹر سلامت اللہ

غلام ربانی تاباں





رامپال



صہبا لکھنوی



انور عظیم



ظہور نظر



احمد ظفر



رفعت سروش



جمیل ملک



احمد ریاض



اختر ہوشیار پوری

جاری شدہ: ۱۹۴۸ء

ادب کی صحت مند اور حیات افروز قدروں کا ترجمان

پرنس روڈ، کراچی-۱

تاریخ ________ ۱۹۵

حوالہ ________

ساقی
منہ نور سے تو صبح دمکی ہے ساقی
[illegible] سیرو رہی ہے جب [illegible]
شمع مفلس [illegible] بس خبر ساقی
[illegible] تھا اسیر [illegible] ہے
[illegible] دکان [illegible] ہوئی ہے
[illegible] صبح [illegible]
[illegible] وکیراں

بدلی میں وہ پُروائی کے جھونکے سَنکے
طاؤس کی گونج میں وہ طبلے ٹھنکے
چھلکاؤ، گھٹا اُٹھی، ساغر چھلکاؤ
ٹھنکے، رقاصہ کے وہ گھنگھرو ٹھنکے

★

راتوں کو فضا پہ لاکھ جلوے دیکھے
اُڑتے ہوئے نقرئی ہیولے دیکھے
اور صبح جو دمکی تو ہوا ابر غلطاں
اپنے ہی دماغ کے پرخچے دیکھے

جوش ملیح آبادی

کارِ مرداں

شگاف جس نے نہ ڈالے ہوں آسمانوں میں
زمیں کا محرمِ اسرار ہو تو کیونکر ہو

نہ ہو نگاہ میں جس کی قوامِ شیرینی
حریصِ تلخیٔ گفتار ہو تو کیونکر ہو

نہ ہو ضمیر میں جس کے مذاقِ آزادی
وہ مُرغ مرغِ گرفتار ہو تو کیونکر ہو

امینِ منبر و محراب دل نہ ہو جس کا
رہینِ کوچہ و بازار ہو تو کیونکر ہو

نہ جس نے دہر کی تصویر اُلٹ کے دیکھی ہو
وہ شخص نقش بہ دیوار ہو تو کیونکر ہو

نہ ہو شیوخ کے کارِ دگر سے جو واقف
حریفِ جبہ و دستار ہو تو کیونکر ہو

مزاجِ شام و سحر سے نہ ہو جو شخص آگاہ
وہ زلف و رخ کا پرستار ہو تو کیونکر ہو

مقامِ صحتِ کامل جسے نہیں معلوم
کسی کے عشق میں بیمار ہو تو کیونکر ہو

سُنی ہی جس نے نہ ہو تشنہ زندگی کی پکار
وہ نغمہ سنج و قدح خوار ہو تو کیونکر ہو

جو نامراد نہ ہو پادشاہِ کشورِ عقل
گدائے خانۂ خمار ہو تو کیونکر ہو

بہائے جنسِ خوشی کی خبر نہ ہو جس کو
متاعِ غم کا خریدار ہو تو کیونکر ہو

نہاں ہو جس کی نظر سے مسیحیت کا عروج
صلیب کا وہ طلبگار ہو تو کیونکر ہو

جزائے خیر کی پستی پہ ہو نہ جس کی نگاہ
حدیثِ خلد سے بیزار ہو تو کیونکر ہو

جسے نصیب نہ ہو معرفت تجلّی کی
وہ تیرہ بخت سیاہ کار ہو تو کیونکر ہو

نظر میں جس کے نہ ہو رازِ عصمتِ مریم
وہ روسیاہ گنہگار ہو تو کیونکر ہو

دل و دماغ گر اقرار کے نہ ہوں نقاد
زباں کو جرأتِ انکار ہو تو کیونکر ہو

خاص نمبر ۱۹۵۲ء

جاری شدہ : ۱۹۴۵ء

ادب کی صحت مند اور حیات افروز قدروں کا ترجمان

برنس روڈ۔ کراچی-۱

تاریخ ۱۹۵ء حوالہ ______

ابھی تو بحر و بر پہ کہر سی ہیں تیرگی وہ صدا اسیر
ہمیشہ یوں انحصار تو ہو وہ کائنات کو جھٹا شر

ابھی تو آدمی اسیرِ دام ہے عندم ہے
ابھی تو زندگی صدائے انقلاب کا پیام ہے

ابھی تمام زخم و داغ ہے تمدنِ جہاں
ابھی رخِ بشر پہ ہیں بہیمیت کی جھائیاں

ابھی تو داستانِ ہستی پر ہوس شہریاروں کی
ابھی تو خون اشک ہے آنکھوں میں ستاروں کی

ابھی ہر دل شکست کا راج ہونے والا ہے
ابھی ستم حیات میں شام کا جام ہونے والا ہے

فا[illegible]

کراچی ۳/۱۱/۵۲

افکار ۲۱ کراچی

پروفیسر شور

استبداد

توحید کے بازو ہوں کہ تثلیث کے شہپر
رہ جاتے ہیں دونوں مرے شعلوں میں الجھ کر

الہام کو دی ہے مرے انفاس نے لوری
عرفان کو جھولے میں سلایا ہے تھپک کر

"مومن" کا نفس ہو کہ "برہمن" کی نظر ہو
یہ بھی مری تلوار ہے، وہ بھی مرا نشتر

ایماں مرے دار پہ کھنچ جاتے ہیں بے جرم
سقراط مرے زہر کو پی جاتے ہیں ہنس کر

زرتشت کا سوچ ہو کہ گوتم کی سحر ہو
ظلمات کی میزان میں تلتے ہیں برابر

ترکش کے مرے تیر ہیں مسموم و جگر دوز
تیمور و ہلاکو ہوں کہ اسکندر و قیصر!

ہر دور میں ڈھلتے ہیں شہیدوں کے لہو سے
جمشید کی مسند ہو کہ چنگیز کا خنجر

مزدور کا شیون ہے مرے ساز کا آہنگ
دہقان کے آنسو ہیں مرے تاج کے گوہر

دیتے ہیں جہاں قیصر و فغفور اذانیں
جمہور کی لاشوں سے بنا کرتے ہیں ممبر

سلطانی و میری کی خدائی پہ نہ جانا
سونے کی سلوں سے بھی تراش جاتے ہیں آذر

لب دانش و حکمت کے جہاں میں نے سیئے ہیں
ڈالی ہے وہاں رات نے خورشید پہ چادر

تو نے جسے سمجھا ہے ضمیرِ حرم و دیر
بجھتی ہے وہی شمع مری پھونک سے اکثر

کعبے کا الم ہو، کہ کلیسا کی فغاں ہو
تھمتے نہیں طوفان ٹھہرتی نہیں صرصر

تسبیح سے گلتی نہیں افلاس کی زنجیر
اے حلقہ بگوشانِ تنک فہم و سبک سر!

ہو وسعتِ افلاک میں جبریل کی پرواز
شاہین کا پنجہ ہے ممولوں کا مقدر

زنجیر بھی کٹ جائے تو ہوتے نہیں آزاد
لکھا ہے لہو سے یہ غلاموں کی جبیں پر

"ہے ماتمِ انسانیت و عدل و مساوات"
دیوار نہ سن لے کوئی آہستہ کرو بات!!

جاں نثار اختر

ستاروں کی صدا

پچھلے پہر ماہِ تمام
تاروں سے تھا یوں ہمکلام
اے نوریانِ آسمان
جلوہ کنانِ آسمان
مانا کہ تم پُر نور ہو
پھر بھی زمیں سے دور ہو
دنیا سے ہوں نزدیک میں
کہتا ہوں تم سے ٹھیک میں
انساں نہیں اب بے ضمیر
شب تاب افسوں میں اسیر
اب وہ امیدیں توڑ دو
صدیوں کی باتیں چھوڑ دو
سمجھا کئے اہلِ زمیں
جب تم کو قسمت کے نگیں
تم رہبری کرتے رہے
افسوں گری کرتے رہے
تقدیر کی ظلمات میں
غم کی اندھیری رات میں
انساں مگر بھٹکا کیا
کانٹا کوئی کھٹکا کیا
جو دیں نہ منزل کا سراغ
کس کام کے ایسے چراغ
لیکن گیا وہ دور اب
انسان ہے کچھ اور اب
جاگا ہے صدیوں کا شعور
راہوں میں ہے منزل کا نور
نظریں ستاروں سے بلند
ڈالے فضاؤں پر کمند
ہر عزم عزمِ استوار
ہر حوصلہ گردوں کا شکار
اب آدمی بیدار ہے
رفتار ہی رفتار ہے
گیتی کے اب دن پھر چکے
اب تم نظر سے گر چکے
نخوت میں پھر بھی چور ہو
کس بات پر مغرور ہو

○

زہرہ وہ خود اپنی مثال
رقاصۂ حسن و جمال
اٹھلائی سو انداز سے
کہنے لگی کس ناز سے
معلوم کیا تجھ کو قمر
ناقدرداں ہے یہ بشر
انساں کو اے ماہِ کمال
کس نے دیا ذوقِ جمال
بے آب تھی اس کی سحر
بے کیف تھی اس کی نظر
ذوقِ سحر میں نے دیا
حسنِ نظر میں نے دیا
سُن کر مرا سیمیں رباب
انگڑائی لے اٹھا شباب
یہ زندگی یہ بانکپن
یہ عشق و الفت کی لگن
یہ نوجوانی کا نشاط
یہ دو دلوں کا اختلاط
عیش و طرب کا یہ وفور
یہ رقص و نغمہ کا سرور
مجھ سے سبھی کچھ تو ملا
اور آج اس کا یہ صلہ
معبد مرے ویران ہیں
کیا خوب یہ انسان ہیں

○

کہنے لگا سُن کر قمر
زہرہ ذرا تو غور کر
بیتے زمانے اب کہاں
اصنام خانے اب کہاں
انساں کی نادانیاں
ختم کر چکیں پیشانیاں
خود دیکھ کر میرا جمال
کھلتا تھا بچے کی مثال
کچھ بھی نہیں معلوم تھا
انسان بہت معصوم تھا
بے شک ترا حسن و جمال
دنیا میں تھا ضرب المثال
رہنے دے اب وہ طمطراق

بدلا ہے دنیا کا مذاق
بدلے گئے افکار بھی
وہ حسن کا معیار بھی
اب حسن تاروں میں نہیں
شب کے نظاروں میں نہیں
چشم بشر میں ہے زمیں

اب چاند تاروں سے حسیں
اب آب و گل میں حسن ہے
اب سنگ و سل میں حسن ہے
اب حسن ہے ذرات میں
طوفاں بدل قطرات میں
اب ارتقا میں حسن ہے
جہدِ بقا میں حسن ہے
محنت کشی میں حسن ہے
خود زندگی میں حسن ہے
اب وہ ترا افسوں نہیں
انساں ترا ممنوں نہیں
تو نے بصد مشق و کمال
ڈالے نظر پر خوب جال
محفل سجائی ناز کی
چھیڑیں صدائیں ساز کی
ہر عیش کی ترغیب دی
ترغیب دی ترکیب دی
ہر قلب کو دہکا دیا
ہر اک قدم بہکا دیا
تو نے پلائی بے حساب
انساں کو غفلت کی شراب
انساں طرب میں کھو گیا
اپنے سے غافل ہو گیا
رستہ نہ منزل کا پتا
ہو جھوٹ تو مجھ کو بتا!

○

تھا مشتری کھویا ہوا
اک بار یوں گویا ہوا
تو دوست ہے میرا قمر
مجھ پر تو یہ تہمت نہ دھر
میں قاضیِ افلاک ہوں
ہمدردِ اہلِ خاک ہوں
مانا زمیں سے دور ہوں
میں عدل میں مشہور ہوں
شیوہ مرا بذل و کرم
ممنوں مرے اہلِ ہمم
املاک بخشی زر دیا
گنجینۂ گوہر دیا
یہ کاخ ہائے سربلند
رفعت میں گردوں سے دوچند
یہ طاق و ایوان و قصور
یہ ضو فشاں لمعاتِ نور
یہ جود و بخشش کس نے کی
ایسی نوازش کس نے کی
انساں آخر ہے کدھر
مجھ سے ملائے تو نظر

○

کہنے لگا یہ ماہتاب
آساں ہے تیرا جواب
تو سعدِ اکبر ہی سہی
ہم سب سے خوشتر ہی سہی
اے ساکنِ چرخِ ششم
تو کن خیالوں میں ہے گم
ہاں قاضیٔ افلاک ہے
شاید جبھی چالاک ہے
میں جانتا ہوں تیری چال
بانٹا ہے جیسے ملک و مال
کرتا رہا ہے تو سدا
تفریقِ سلطان و گدا
تو منعموں کے ساتھ ہے
تیری بھلا کیا بات ہے
ان کو زمیں دی زر دیا
ان کا بھرا گھر بھر دیا
لیکن یہ بیچارے عوام
صدیوں سے بے نیل مرام
کیسے بسر کرتے رہے
کیونکر گذر کرتے رہے
ان سے تجھے کیا کام تھا
تیرا تو اونچا نام تھا
تیری نظر میں ہر نفس
تابندہ محلوں کے کلس
تیری ضیائیں تاج میں
یاقوت میں پکھراج میں
تکتے رہے خشت و خزف
دیکھا نہ تو نے اس طرف
دیکھا نہ محلوں سے پرے
پھرتے ہیں کتنے بے گھرے
اک سمت یہ زرداریاں
اک سمت یہ ناداریاں
کیا عدل کیا انصاف ہے
بیشک ترا دل صاف ہے
سکھلا دیا ذاتی مفاد
پیدا کیے لاکھوں فساد
مانگتی بھی تو چلتا ہے چال
لاتا ہے دنیا پہ وبال

ظاہر ہیں تیری بستیاں
تو نے اجاڑیں بستیاں
ویران گلشن ہو گئے
جو شہر تھے بن ہو گئے

ہاں شوق سے انکار کر
مجھ سے تو آنکھیں چار کر

○

مریخ وہ آتش مزاج
پہنے ہوئے کرنوں کا تاج
ہر دم لئے شمشیر ساتھ
رکھے ہوئے قبضہ پہ ہاتھ
سنکر قمر کی گفتگو

برہم ہوا وہ شعلہ خو
بولا بھڑک کر اے قمر
بیکار کی باتیں نہ کر

سنتا رہا تیرا غلو
میرا مسلّم ہے علو
انساں کو طاقت میں نے دی

یہ استقامت میں نے دی
بجلی سے بڑھکر دی نظر
فولاد کا بخشا جگر
بخشی شجاعت کی ترنگ
عزم وغا و جوشِ جنگ
انساں کہاں تھا تیغ زن
میں نے بنایا صف شکن
یہ جوشن و تیغ و کمر
میں نے سجائے جسم پر
زرہوں سے سینے سج گئے
نصرت کے ڈنکے بج گئے
وہ عرصہ ہائے کارزار
تیغوں سے وہ اڑتے شرار

وہ طنطنہ افواج کا
اک سیل سا امواج کا
بڑھتے جوانانِ شجیع
میداں میں با شانِ وقیع

تولے ہوئے ہاتھوں میں تیغ
وہ بے درنگ و بے دریغ
افرادِ لشکر جوق جوق
صوتِ جلاجل شور بوق
آتے ہوئے زیرِ کمند

وہ قلعہ ہائے سربلند
فتح و ظفر لیتے قدم
اٹھتے وہ شاہانہ علم
میرا ہی فیض ذات ہے
میدان میرے ہات ہے

○

بولا قمر، مریخ اس
کیوں باندھ رکھی ہے یہ دھن
اے میرے جلادِ فلک
پہونچا نہ کوئی تجھ تلک
تو برجِ عقرب کا مکیں
تطہیر تری نیش آفریں
تیری یہ گرم و خشک سانس
جیسے اُٹھے مرچوں کی دھانس
شیوہ ترا جنگ و جدال
اس فن میں تو صاحب کمال
انساں کو دیکر حرص و آز
تو نے بنایا جنگ باز
دیکر کمان و تیغ و تیر
انساں کا چھینا ضمیر
یہ ملک گیری کی ہوس
سنگی نظر، بھڑکا نفس

جو فتنہ و غاجب بڑھ گیا
دریا لہو کا چڑھ گیا
غارت گری ہے تیرا کام
شاہد ہیں کتنے قتل عام
تیرے لئے گلگوں شفق
تاریخ کے خونی ورق
کھینچا ہے با حسن و کماں
کیا نقشۂ جنگ و جداں
میں نے بھی ان آنکھوں سے خاک
دیکھی ہیں جنگیں ہولناک
ہنگامہ ہائے کارزار
انساں پہ وہ انساں کا وار
طاری وہ تیغوں پر جنوں
اڑتا ہوا انساں کا خوں
وہ لاشہ ہائے بے کفن
وہ ٹکڑے ٹکڑے فرق و تن
اٹھتی زمیں کے دل سے چیخ
ہلتی فلک کی چوب و میخ
یہ عرصۂ فوج و سپاہ
انسانیت کی قتل گاہ
اک مذبح و مقتل ہے یہ
اک خون کی دلدل ہے یہ
لڑنا شجاعت تو نہیں
انساں کی فطرت تو نہیں
تو نے سکھائی یہ روش
ذہنوں میں بھر دی یہ تپش
بخشیں سپہ سالاریاں
افواج کی سرداریاں
لیکن ذرا اخود غور کر
کس کام کا ایسا اثر
افسر بنا سلطاں بنا

انساں کہاں انساں بنا
ملنے لگا کیا تو مجھ سے مات
لیکن کہوں گا صاف بات
آتا ہے جب میزان میں
رہتا نہیں اوسان میں
ظالم میں ہمت ہی کہاں
تابِ عدالت ہی کہاں
تجھکو ستم ڈھانا ہے راس
آجا زمیں سے اور پاس

○

بولا زحل اے ماہ تاب
باتوں کا تیری کیا جواب
دیتے تو ہوں میں سب سے دور
لیکن کہوں گا یہ ضرور
ہے مرتبہ میرا عظیم
ہوں چرخ ہفتم پر مقیم
دعویٰ بڑا کرتا نہیں
کہتا ہوں سچ ڈرتا نہیں
ہر "زائد الانوار" میں
ان ازنح کے ادوار میں
کتنا رہا ہوں خیر خواہ
تو خود بھی ہے اسکا گواہ
پامال دشمن کر دیئے
سبلے خار گلشن کر دیئے
اپنے عمل سے بے دریغ
سخت محنت کو فروغ
بنتے مکاں سجتے یہ گھر
تعمیر ہوتے بام و در
محمل و سرا سقف و ستون
اٹھتے مرے زیرِ شگون
جب بھی ہوا ہوں میں قوی
بخشی ہے تاثیر نوی
کچھ اور تو کہتا نہیں
الزام میں تہمت نہیں
کیا شک شرف میں شان میں
پورا ہوں جب میزان میں

○

بولا قمر مجھ کو زحل
معلوم ہیں تیرے عمل
معلوم ہے سب تیرا حال
سیدھی کبھی الٹی ہے چال
تیرا ہبوط و احتراق
خود ہے بنائے افتراق
دلمیں شقاق ڈال دی
باہم عداوت ڈال دی
تونے کئے دشمن ہلاک
لیکن کہوں کیا منہ میں خاک
خود دشمنی کا تو سبب
تجھ سے ملے رنج و تعب
کھیلا محبت سے بھی کھیل
تو اور منڈھے چڑھنے دے بیل
پہلے جدائی ڈال دی
گویا مصیبت ٹال دی
پھر گر گئے تسخیر کے
صدقے تری تدبیر کے
آساں ہے دل کا توڑنا
مشکل ہے ٹکڑے جوڑنا
شیخی نہ کر، ڈینگیں نہ مار
قوت ہے تیری مستعار
قصر و محل بنوا دیئے
لیکن وہ گھر بھی ڈھا دیئے
یونہی نہیں بدنام ہے
تیری نحوست عام ہے
ہے دور انسانوں سے تو
مانوس ویرانوں سے تو
تیرا سیہ ملبوس ہے
سب سے بڑا منحوس ہے
زیرِ اثر اجڑا مسان
یا بدنصیب ہندوستان
تو پاسبانِ افلاک کا
کیا ہو رہا ہے۔ خاک کا
تیرا کرم ہے مستند
کر دی مروت کی بھی حد
غم سے مشرف کر دیا
انسان کا دل بھر دیا
پھر یوں کہ غم کا غم نہیں
یہ بھی کرم کچھ کم نہیں

○

جب تھا عطارد اب تلک
بولا کہ اے ماہِ فلک
تو جانتا ہے بے گماں
میں ہوں دبیرِ آسماں
فرمانِ مشیت کے تمام
لکھتا رہا ہوں صبح و شام
بے وجہ لعادت جو رہیں
رکھتا نہیں یہ طور میں
میری طبیعت معتدل
ہوتا نہیں میں مشتعل
میرا تو اس انسان پر
ہے عہدِ طفلی سے اثر
یہ ذوق و شوقِ علم و فن
میں نے لگائی یہ لگن
یہ عقل و دانش میں نے دی

...کو تابش میں نے دی
...کو حکمت بخش دی
...بصیرت بخش دی
...نے کیا مانا ئے راز
...فلک انساں پہ باز
...دیئے انساں کو
...کھلا دیئے انسان کو
...راز ہائے مملکت
...ے امورِ سلطنت
...تفکر دے دیا
...تدبر دے دیا
...سان پر اے ماہ تاب
...کرم ہیں بے حساب

...ن کر قمر یہ گفتگو
...نے لگا یوں دو بدو
...ہے دیر آسماں
...شبہ بیشک بے گماں
...ہاتھ میں تیرے قلم
...چاہے تو کر دے رقم
...ی کریگا کیا سوال
...علوم ہے لوپر کا حال
...سان بے چارا غریب
...آ رہا صدیوں فریب
...ھیرے! اندھیرے!
...ندیکا سب پھیر ہے
...تا مذاق علم و فن
...ن ٹھیک ہے تیرا سخن
...بن جو حکمت تو نے دی
...سی بصیرت تو نے دی
...کو تو خود معلوم ہے
...سان تو موہوم ہے

ذہنوں پہ ڈالا خوب جال
پھیلا دیا دامِ خیال
امثال میں اُلجھا دیا
کیا سے کیا سمجھا دیا
چھینی عمل کی اہلیت
ذہنوں میں گھولی عینیت
دنیا بنی اک جائے ننگ
ایسی پلائی تو نے بھنگ
پھر تیرے سِرِ مملکت
یہ رمز ہائے سلطنت
یہ تاجِ شاہی کا فریب
ظلِ الٰہی کا فریب
صورت بدل دی قہر کی
دی جام میں تہ زہر کی
انسان انساں کا غلام
کب کا لیا یہ انتقام
یہ تیری افسوں سازیاں
اچھی لگائیں بازیاں
باقی نہ رکھی کچھ کمی
بازی جمی تو بس جمی
تو مشترک تاثیر میں
چلتا ہوا تدبیر میں
پر ہے نحس دید نہیں
تجھ کو کسی سے کد نہیں
بد ہے کہ کوئی نیک ہے
تو جان و دل سے ایک ہے
تو وہ ہے جو بدلے نگاہ
کتنوں کا چھینے عز و جاہ
مجھ پر عیاں ہے تیرا حال
الٹی نہ چل یوں مجھ سے چال
رتبہ سہی تیرا دو چند
میں ہی تو ہوں رجعت پسند

تو اور بھی خوار و بشر
شرم اے عطارد شرم کر
چپ ہو گیا جب ماہتاب
دیکر عطارد کو جواب
گہری خموشی چھا گئی
تاروں کی لَو کجلا گئی
کچھ دیر یہ عالم رہا
آخر ستاروں نے کہا

اے چاند سچ کہتا ہے تو
حق پر سدا رہتا ہے تو
ہم فی الحقیقت بے ضمیر
رجعت پرستی میں اسیر
بنتے رہے لاکھوں طلسم
کام آ گیا تاثیرِ اسم
ظلمت کو چمکا تے رہے
لیں خواب دکھلاتے رہے
انساں کو ہم نے بے قصور
بھٹکا دیا منزل سے دور
سچ پوچھ تو دشمن رہے
رہبر نہیں رہزن رہے
تو فطرتاً ہم سے بلند
انساں کا سچا دردمند
گیتی سے تجھ کو پیار ہے
گیتی کو خود اقرار ہے
تجھ سے ہنسے دھانوں کے کھیت
چمکی ہر اک ساحل کی ریت
بڑھتے رہے چاہت کے ساتھ
تیرے لئے موجوں کے ہاتھ
بنتی رہی تیری چمک
بچوں کے سینے میں ہمک
دل مفلسوں پر تیرا داغ
ان کے گھروں کا تو چراغ

دیکھا بشر کو جب زبوں
سر ہو گیا تیرا نگوں
انصاف میں کامل ہے تو
اک جگمگاتا دل ہے تو
ہاں ٹھیک ہے ماہِ مبین
انسان وہ انساں نہیں
ہے آج سرگرم خرام
پہلے سے بڑھ کر تیز گام
یہ تو بتا لیکن قمر
ہے کون اس کا راہ بر؟
کچھ اور مہ پارے ہیں کیا؟
کچھ دوسرے تارے ہیں کیا؟

○

یوں مسکرایا ماہتاب
جیسے کھلے سو میں گلاب
کھولا دریچہ عرش کا
جاگا نظارہ فرش کا
اک نور سا بہنے لگا
ہنس کر قمر کہنے لگا
آتا ہے وہ دیکھو نظر
اڑتا ہوا یہ زال پر
وہ پرچم گردوں نشاں
گل ریز، گلگوں، گل فشاں
یہ صفحۂ گلشن نگار
دامانِ ابر نو بہار
یہ قلب گیتی کی ترنگ
تازہ ہمائے لالہ رنگ
یہ شہپر جبریل نو
انسان کے دل کی شرح لو
یہ جلوۂ لالہ طراز
یہ شعلۂ شبنم نواز
یہ سایۂ امن و امان
انسانیت کا پاسباں
یہ مشعلِ راہِ حیات
چشم و چراغ کائنات
یہ پرچم یاقوت فام
یہ بادبانِ صبح و شام
یہ مصحفِ لالہ ورق
گیتی سے ابھری شفق
اور اس شفق کے درمیاں
وہ اک ستارہ ضو فشاں!
تم عرش کے سینے کے داغ
گیتی کا یہ چشم و چراغ
تم قطرہ ہائے انفعال
یہ شبنم خاور جمال
تم دردِ جامِ آسماں
یہ ساقی اہلِ جہاں
تم دورِ گردشہائے سپہر
یہ عظمت انساں کا دہیر
تم ظلمتِ ماضی میں چور
یہ حال و مستقبل کا نور
پرتو سے اسکے تابناک
روئے زمین و قلب خاک
ہر تیرگی کٹ کٹ گئی
صدیوں کی ظلمت چھٹ گئی
ہاں اس سے جاگی کائنات
انگڑائی لے اٹھی حیات
جاگا افق، جاگی فضا
جاگی زمیں، جاگی ہوا
جاگے شجر، جاگے حجر
جاگے خزف، جاگے گہر
جاگا چمن، جاگی پھبن
جاگا جبل، جاگا دمن
جاگے مکاں، جاگے مکیں
جاگا عمل، جاگا یقیں
جاگا دہن جاگا خطاب
جاگا قلم، جاگی کتاب
جاگی نظر، جاگے قدم
جاگے نشاں، جاگے علم
جاگا لہو، جاگا شباب
الانقلاب، الانقلاب
دیکھو جہاں بیدار ہے
ہر کارواں بیدار ہے
اس ایک تارے کی ضیا
گلگوں نظارے کی ضیا
ہر کارواں کی راہ پر
سارے جہاں کی راہ پر
اس کی روپہلی چھاؤں میں
پر لگ گئے ہیں پاؤں میں
منزل کی جانب ہے رواں
ہر قافلہ، ہر کارواں
پر سب کی منزل ایک ہے
انسان کا دل ایک ہے
کیا چیز ہیں ملک و مقام
ہیں ایک دنیا کے عوام
یہ سرخ جانبازانِ روس
آزاد فرزندانِ روس
یہ والگا کے نورِ عین
یہ قلب سائبیریا کے چین
کرغیز و ازبک نوجواں
ہنستے ہوئے تاجک کساں
یہ کجکلاہانِ جمیل
شانِ بخارا کی دلیل

قازان کے یہ نونہال
ملکِ بدخشاں کے یہ لال
یہ چین کے لختِ جگر
یہ ماؤ کے نورِ نظر
یہ کوریا کے سرفروش
یہ آندھرا کے سخت کوش
تبت، ملایا، ویت نام
ملتان و جاوا کے عوام
بنگال و برما کے دلیر
ارضِ تلنگانہ کے شیر
دہقان مزدور و کسان
سارے جہاں کے نوجوان
معمار، مانجھی، کان کن
شیشہ تراش و تیشہ زن
صاحبِ ہنر، سائنس داں
اہلِ قلم، اہلِ زباں
فن کار، دستکار و خطیب
تاریخ داں، شاعر، ادیب
کتنے مصور بے مثال
کتنے مغنی باکمال
یہ مشترک اک کارواں
انسانیت کا نغمہ خواں
ہر سو لوا ظلمت شکن
گاتا ہوا یہ سالبس
یہ جعفری آتش نگار
شعلہ طراز و شعلہ بار
پھر گیت یہ مخدوم کے
بڑھتے جواں یہ جھوم کے
ناظم کی لے گونجی ہوئی
سردار کی لے گونجی ہوئی
گونجی نووِدا کی صدا

گونجی ہوا، گونجی فضا
گونجی ہوئی بانگِ رحیل
گونجا ہوا ہر سنگِ میل
گونجے گراں سر کوہسار
گونجے ہوئے صدیوں کے غار
گونجے ہوئے راہوں کے خم
گونجے ہوئے بڑھتے قدم
گونجا ہوا ہر سنگِ وصل
گونجا ہوا دھرتی کا دل
گونجا ہوا اک کارواں
گونجا ہوا گلگوں نشاں
کس عزم سے کس آن سے
کس فخر سے کس شان سے
بڑھتا ہوا باصد شرف
گلرنگ منزل کی طرف

○

منزل نئی، انساں نیا
محفل نئی ساماں نیا
حکمت نئی، عرفاں نیا
آئیں نئے، فرماں نیا
کیسا ریاست کا وجود
کیا آمریت کا وجود
یاں شہریاری ہے کہاں
سرمایہ داری ہے کہاں
باقی نہ طبقاتی نظام
باقی نہ آقا و غلام
باقی نہ استحصال و جبر
باقی نہ حیوانوں کے طور
باقی نہ وہ دار و رسن
باقی نہ وہ مہرِ دہن
باقی نہ نسلی برتری
باقی نہ جنگِ زرگری
ابرِ سیہ چھائے نہیں
یاں جنگ کے سائے نہیں
زائل ہے تیغوں کا جنوں
بہتا نہیں انساں کا خوں
لگتی نہیں مانگوں میں آگ
لٹتا نہیں ہنستا سہاگ
ماؤں کے سینے شق نہیں
بچوں کے چہرے فق نہیں
یاں رنگ ہی کچھ اور ہے
یہ ڈھنگ ہی کچھ اور ہے
نے تخت ہے نے تاج ہے
محنت کشوں کا راج ہے
جذبہ نیا ایجاد کا
رشتہ نیا افراد کا
یہ کارخانے، مِل، زمیں
اوزار، کل پرزے، مشیں
یاں اجتماعی ملک و مال
ذاتی غرض کا کیا سوال
ہل جوتتے مل کر کسان
ہنستا ہوا کھیتوں میں دھان
خود جھومتا گاتا اناج
پہنے ہوئے خوشوں کا تاج
یہ رقص کرتی بالیاں
دیتی ہوائیں تالیاں
دریا لٹاتے یاں گہر
کانیں اگلتیں سیم و زر
غواص ہوں یا کان کن
محنت کی ہر دل میں لگن
باہم عمل کا اشتراک
ڈھلتی ہوئی سونے میں خاک

یاں پیدآور قوتیں
خود زندگی کی دولتیں
یاں آدمی کی قدر ہے
محنت کشی کی قدر ہے
محنت سے انساں کا وقار
محنت سے عز و افتخار
ہاتھوں پہ محنت کا غرور
آنکھوں میں محنت کا سرور
تفریقِ محنت یاں نہیں
ایسی حماقت یاں نہیں
افکار ہیں بدلے ہوئے
کردار ہیں بدلے ہوئے
آزادیاں تقریر ہے
آزادیاں تحریر ہے
آزادیاں ہر انجمن
آزادیاں ذوقِ سخن
آزادیاں شعر و ادب
آزادیاں جہد و طلب
آزادیاں ذوقِ جمال
آزادیاں حسنِ خیال
آزاد انسانوں کا دل
آزاد رومانوں کا دل
انسانیت بستی ہے یاں
خود زندگی ہنستی ہے یاں
چہروں پہ یاں صحت کا رنگ
ندی کی لہر میں اک ترنگ
بچوں کی رقصندہ نظر
جیسے کسی تتلی کے پر
اک رنگ برساتی یہاں
مانگوں کی گلگوں کہکشاں
رقصاں خوشی ہر چھاؤں میں
پازیب باندھے پاؤں میں

یاں گیت ہے یاں پیار ہے
یاں زندگی سرشار ہے
یاں آب و گل کی آبرو
یاں سنگ و سل کی آبرو
یاں خار و خس کا احترام
یاں ہر نفس کا احترام
یاں تجربہ، حکمت، عمل
صدیوں کے وہموں کا بدل
کرنیں لٹاتی آب و رنگ
بلور بنتے خشت و سنگ
قطروں میں بجلی کا شرار
ذروں میں جوہر کا نکھار
یاں بحر و بر پر اقتدار
برق و شرر پر اقتدار
ہاتھوں میں انساں کے مدام
سرکش عناصر کی لگام
قبضہ میں یاں تدبیر ہے
قبضہ میں یاں تقدیر ہے

○

انساں بڑھے گا اور بھی
آئے گا ایسا دور بھی
ہوگا فضا پر اختیار
قدر و قضا پر اختیار
آئے گا گردوں زیرِ دام
قبضہ میں ہونگے صبح و شام
خود کہکشاں افلاک پر
بن جائے گی اک رہگزر
اے ماہ پارو! کیا ہو تم
کل خود قدم چومو گے تم

○

یہ سرخ منزل کی فضا
یہ عرصہ گاہِ ارتقاء
اک عرصۂ لامحدود ہے
اک عالمِ مقصود ہے
یہ جنتِ نوعِ بشر
یہ مرجعِ قلب و نظر
یہ منزلِ انسانِ نو
یہ حاصلِ ایمانِ نو
خود ارتقا بھی دنگ ہے
وہ کعبۂ گلرنگ ہے

○

چپ ہو گیا جب وہ قمر!
چھایا فضا پر وہ اثر
تاروں کی سانسیں رک گئیں
زہرہ کی نظریں جھک گئیں
بھولا وہ دعوئ مشتری
سب رہ گئی نیک اختری
مریخ دل میں کٹ گیا
اپنی نظر میں گھٹ گیا
خود سے زحل شرما گیا
رخ پر پسینہ آ گیا
سہما تھا عطارد کا بھی خم
چپ رہ گیا رکھ کر قلم
اور پھر فضا میں دفعتاً!
لے بن کے گونجی ہر کرن
گونجی ستاروں کی صدا
کل ماہ پاروں کی صدا
گلگوں ستارے کو سلام
رہبر ستارے کو سلام
اس سرخ پرچم کو سلام
اس سرخ عالم کو سلام
اے آدمِ نو زندہ باد
تابندہ و پائندہ باد

مخمور جالندھری

میری جان راحت

حیات نے تیس سال پھاندے
حیات کی طے شدہ مسافت نظر میں رکھے
میں سوچتا ہوں
خوشی بھی البیلی اک گوالن ہے جسم مکھن تو دودھ جوبن
ہر آن انگیا بدل رہی ہے
جوان تا ہے کے گولنے کی بنسری کی سریلی دھن پر
قدم اٹھاتی، قدم ملاتی
چلی ہی آتی ہے ساتھ میرے
یہ آج بھی بیوفا نہیں ہے
یہ کل عدوئے وفا نہیں تھی
کہ کل بھی کتنا عجیب کل تھا
بگاڑنے میں دل کے اور ذہن کے سمن زار مشکبو میں
شعور کے سب چراغ مدھم سے جل رہے تھے
یہ کل جو تاریخ کا جو انسان کا لڑکپن ہے بھولپن ہے
اسی سخر میرا اور سانولے کل کے جھٹپٹے میں
الم تھے قسمت، مصیبتیں تھیں رضا خدا کی
کہ قناعت تھی، بے بسی صبر تھی، تہی دامنی تھی درویش
بادشاہی

خوشی کی الھڑ حسین گوالن!!
حویلیوں میں مٹکنے والی، بلند محلوں میں رہنے والی
کھنکتی چاندی کے توڑ بندھن مروڑ ریشم کی ڈوریوں کو
کبھی کبھی مجھ سے چاندراتوں میں ملنے آتی
فلک پہ تاروں کی ٹوٹی لڑیوں سے جھانک لیتی
رہٹ کی روں روں پہ گنگناتی ہوئی سی ملتی
رسیلے چرخوں کی مست گھوں گھوں پہ تال دیتی

کٹوئیں کی منڈیروں پر اور پنگھٹ پہ چوڑیوں میں
چھنا چھنا چھن چھنن چھنکتی
کپاس کے پھول چنتی شفاف انگلیوں میں تڑپ
تڑپ اٹھتی جھلملاتی
ہری بھری کھیتیوں پہ چلتی ہوئی درانتی میں اپنے ہنگے
کو سر سراتی
دلہن کے گجرے، دلہا کے سہرے میں مسکراتی
دکھائی دیتی
میں ڈھونڈ لیتا، میں پا ہی لیتا
طویل گردن کے گرد باہوں میں گودیوں کی مہکتی مست معصومیت
میں اسکو
کھلی ہوئی کھڑکیوں میں اوپر کچھ انکھڑیوں میں لطیف اشارے
سڑک کے نیچے لطیف اشارے وصول کرتی ہوئی نگاہوں
سے وہ چھلکتی
جدائی کے مختصر سے لمحوں کے بعد مجھ سے ضرور ملتی
مگر وہ لاعلمیت کی اور بیہوشی کی نادان سرخوشی تھی

خوشی کی البیلی نازنین جسم مرمریں، گلستاں سراپا
نگاہ فتنہ، جمال جادو، تو بال پیچے
محل کے دیوار و در گراتی، حویلیوں کے حصار ڈھاتی
چلی ہی آتی ہے آج بھی ساتھ ساتھ میرے
اور آج۔ خواب سحر نہیں ہے، مسافت بے خبر نہیں ہے
یہ آج اک آگہی ہے جس سے دماغ جگ مگ ہے
دل چراغاں
یہ آج۔ کرشمہ جہاد پر ہے کرڈی جوانی۔

کہ آج تاریخ ہے پسینہ پسینہ، انساں لہو لہو ہے۔
گھناؤنی لوٹ کی چتا پر نگار مشرق سلگ رہی ہے۔
مگر چتا میں سے شعلہ تند بتیوں کو کھینچے ہوئے انھیں مشعلیں
بنائے

غلیم مشرق کا سینہ جاں، نگار آدم !!
سوئیز کی قتل دخوں بھری آبجو سے للکارتا ہے جب انت
کنگناتا

ملایا، ویٹ نام، کوریا کے گھنے کچھاروں سے دمبدم جب
دہاڑتا ہے
جوان طلبہ ایشیا کے بازاروں اور کوچوں سے مست ہو کر نکلتا ہے
حسین طہران ایسی شہد و شراب ساقی کی سرزمیں سے
نکلتے ہیں لیبیوں کے جب منڈیوں کے تاجر لٹا لٹا کے
ٹھوکروں کے اپنی بیچارگیوں پر
بڑی سراسیمگی سے لے آبرو ئی سے بوریا اٹھائے۔
تو پھر خوشی کی چھبیلی کا فراد احسینہ کے گیسوئے عنبریں کی لپٹیں
دلوں میں کیف و سرور گھولیں رگوں میں سرمستیاں جگائیں
کوئی خوشی اجتماعیت کی خوشی کے ہمسر نہیں ہوئی ہے۔
کہیں تلنگانہ دیا لتا ہے جب اپنے سائے میں لاکھ زر پائیں
اور فیوچک
کہیں کشن گڑھ سے جب سٹالن گراڈ ابھرتا ہے جگمگاتا
کہیں جو سنگین جیلخانوں کے بام و در کانپتے ہیں منہ سے
نکل کے نقش و ظہیر و حکمت
کہیں جو مجمع پہ پھونک دیتا ہے سحر جاوید راؤسن
فاسٹ اور نرودا
کہیں برستے ہوئے گرجتے ہیں لاکھ جیسے کروڑ مکھنے
جوان بوڑھے
کہیں جو مکر وریا، ہوا و ہوس کی مکروہ جھریوں سے نوچ لیتے
ہیں پردے، گویا الناؤ در جیپ
کہیں جب الزام، جھوٹ بہتان اور تہمت کا لاٹھ کے منہ
پھیر پھیرتے ہیں لوگ کیا عظیم طاقت
تو اس گھڑی میں یہ دیکھتا ہوں۔
خوشی کی البیلی نار اپنے مہکتے ماتھوں سے میرا سینہ تھپک رہی ہے

کہ یہ خوشی آگہی کی ادراک و ہوشمندی کی سرخوشی ہے
جسے حیات خضر میسر جسے دوام فلک بھی حاصل۔

○

خوشی کی البیلی نازنیں میری جان، مری دلربا، چہیتی !!
میں لاکھ تجھ سے قریب تو مجھ سے لاکھ نزدیک تر ہے پھر بھی
تو میری ہوتی ہوئی بھی میری نہیں ابھی تیرے راستے میں
محل بھی ہیں اور حویلیاں بھی
کلیسا بھی، بنک بھی فلک بوس بلڈنگوں کے میاں حرم بھی
ابھی تو اسی کروڑ ساتھی ہی میرے ہیں ہمکنار تجھ سے
ابھی تو ٹوٹے ہیں نصف دنیا میں تیرے بند و من
مگر وہاں سے بھی تیرے اغوا کے مشورے ہیں۔
ابھی کئی لندنوں میں، نیو یارکوں میں، روموں میں،
فارموسوں میں پیرسوں میں
یہی ارادہ کیا تھا برلن نے لیکن اس کے مآل عبرت فزا سے
موند کے ہوئے ہیں آنکھیں
ابھی تو میری نہیں، قسم ہے ہمت بشر کی تو میری ہو کر رہے گی پیاری!
کہ میرے بھی ولولے جواں ہیں
مجھے بھی حسرت، مجھے بھی ارماں لئے لئے اپنے ساتھ تجھ کو
خموش گمبھیر پربتوں کی جسیم وسعت کی فصد کھولوں
مہیب دریاؤں کے غضب کو سکوں میں بدلوں
زمین کے بطن بیکراں سے ثمر نکالوں
سمندروں کی تہوں سے لعل و گہر اچھالوں
ستمگر ہیں رسیدہ لوہے کو آدمی کا مطیع کر دوں
یہ دوسروں کیلئے یہ اپنے لئے جو تخلیق ہے۔ یہی ہے حیات آدم
ثبات عالم
خوشی کی البیلی نار تیری مفارقت اب نہیں گوارا
نجات تیری، نجات میری، کڑی کٹھن کشمکش ہے۔ فتح کا اعتماد
اس سے مگر کڑا ہے
یہ وہ طلب ہے کہ ایک دو کیا کروڑ موتیں بھی کچھ نہیں
جو کام آیا تو میرے بچے تری رہائی کا عہد پائیں گے مجھ سے ورثے میں جاتے جاتے
ہوئی نہ اسیر بھی لیس مری جان تو میرے بچوں کے بچے تیرے لئے لڑیں گے
کہ تو ہماری ہے ہم سے چھینی ہوئی ہماری شگفتگی ہے۔

حسن اعرافی

جوشِ راوی، سیلِ نیل

شفق رنگ راوی، شفق لالہ گوں　　زمیں تا فلک ایک دریائے خوں
گلستاں گلستاں دل افگار ہے　　کہ مشرق پہ مغرب کی یلغار ہے

○

افق سے افق تک اڑی گرد سی　　ہوئی شام خونیں قبا سرد سی
چلے، کارخانے کو مالی چلے　　پٹک کر جو ا اور پنجالی چلے
چلے عیش کے قمقمے شہر میں　　مضافات جانے ہیں کس لہر میں؟

○ ○

کھلے آسماں پر کھلی چاندنی　　گلے روشنی سے ملی چاندنی
رواں ہیں خنک نور کی ندیاں　　جھلکتی ہیں رواں بھری کشتیاں
یہ سنگیں چٹانوں سے ٹکرائیں گی　　کنارے پہ شاید پہنچ جائیں گی

دھواں سا لگا ذہن میں تیرنے
انوکھے کچھ کے دیئے سیرنے

○

فلک تا زمیں سرخیاں موجزن　　کہ خونِ تمنائے اہلِ وطن
مرا زخمِ دل آنکھ ناسور ہے　　وہ زمیں سخت ہے، آسماں دور ہے
پرانے شکاری، نئے ہم شکار　　نرالے شکار اور نرالے ہی وار

شہادت کی تیاریاں دیکھنا — قیادت کی مکاریاں دیکھنا!
سلگتی ہیں چنگاریاں، یہ بجھائے — ابھرتے ہیں شعلے، مگر یہ دبائے
تو اے جذبِ ملّی! ہٹا دے اسے — ہٹا دے، حرم میں بٹھا دے اسے
کہ سانچے میں خوابِ اخوت ڈھلے — کئی سو برس کی تمنا پھلے
اٹھے مصر و ایراں بعزمِ قوی — کم آتی ہے ایسی سنہری گھڑی
خلیجِ اختلافات کی پاٹ دے
کڑی آخری ہے اسے کاٹ دے

○

جو مغرب میں آگے بڑھے قافلے — چھٹی ہل کی ہتھی، ہتھوڑے ملے
ہتھوڑے کا پھل تاجری کھا گئی — یہاں بالنے سامری آ گئی
جو مٹھی میں یہ سرزمیں بھینچ لی — تو قدموں تلے سے زمیں کھینچ لی
گلستاں میں کشش کے جھگڑے چلے — بھیانک تباہی کے ساماں ڈھلے
مگر راجہ، ہل اور ہتھوڑے بڑھے — غنیموں نے رستے میں کھودے گڑھے
مریدوں سے دھوکا کیا پیر نے — ہتھوڑے سے زر، ہل سے جاگیر نے
لٹیرے مرے دیس میں رہ گئے
مداری نئے بھیس میں رہ گئے

○ ○

یہ رومان کوشی نیا خواب ہے — کہ دریا ہمہ سیل و گرداب ہے
نئے ناخداؤں پہ ہو اعتبار — سفینہ سلامت ہو قلزم کے پار
ملیں راوی و دجلۂ و نیل آج — مٹے سامریت، مرے سامراج
ابھرتے تموّج کا گر ساتھ دیں — تو کھوئی ہوئی جنتیں چھین لیں
جو بہکائے، اپنا نہیں غیر ہے
اسے اہلِ اسلام سے بیر ہے

صہبا لکھنوی

بشارت

زندگی کے طویل خوابوں کا
سلسلہ خود بخود نہ ٹوٹے گا
خود بخود، گردشوں سے لپٹی ہوئی
ظلمتوں کا نہ ساتھ چھوٹے گا

وقت کے تُند و تیز دھاروں میں   منزلوں کے نشاں ملیں گے ندیم
شت و صحرا کے سنگ ریزوں میں   لالہ گوں پھول بھی کھلیں گے ندیم

جسم کو قید کرنے والے بھی
ذہن کو قید کر نہیں سکتے
فن کی تخلیق رُک نہیں سکتی
زندہ فن کار مر نہیں سکتے

بھوک، افلاس، چور بازاری   ختم ہو گی سماج بدلے گا
ارتقاء زیست کی صداقت ہے   "کل" میں ہر ایک "آج" بدلے گا

غلام ربانی تاباں

مشرقِ وسطیٰ

آگ بھڑکی ہے وہ آتشکدۂ فارس سے
جو بجھانا کوئی چاہے تو بجھا بھی نہ سکے
پھیلتے جاتے ہیں ہر سمت لپکتے شعلے
زد پہ ان شعلوں کی ہے ساحرِ مغرب کا طلسم
تیل - کل جس نے اجالا تھا شبستانِ فرنگ
آج اس آگ کو بھڑکاتا ہے - پھیلاتا ہے
ایشیا پھونکنے نکلا تھا جو نیرو اے دوست
قیصری ساد بکف خود ہی جلا جاتا ہے
ساحلِ نیل ہو یا ساحلِ دجلہ و فرات
ہر طرف آج فرنگی کی چتا جلتی ہے
رات کی بزم میں شعلوں کا یہ رقصِ پیہم
جیسے اک آگ کا طوفان امنڈ آیا ہے
آبِ اردن سے بڑی آس لگا رکھی تھی
آج اس نہر کا پانی بھی نہیں اُن کے لئے
کوئی عبداللہ ثانی بھی نہیں اُن کے لئے

ظہور نظر

شام

شام کتنی اداس ہوتی ہے
ہر کرن منہ چھپا کے روتی ہے
رات چھنتی ہے جب اجالے سے
ذہن دھندلا کے رہ سا جاتا ہے
دل سنبھلتا نہیں سنبھالے سے
روح کی ایک ایک لرزش کو
ڈس رہا ہے سکوت جھیلوں کا
آرزوئے شفق سے جھانکتا ہے
فاصلہ بے شمار میلوں کا
تند رو جنگلی ہواؤں میں
چیختا ہے گداز ٹیلوں کا
شہر کے ہاؤ ہو سے دور جہاں
سلسلہ ختم ہے فصیلوں کا
ایک پُر ہول دائرہ بن کر
قافلہ اڑ رہا ہے چیلوں کا
قحطِ بنگال یاد آتا ہے
دل تھکے ماندے آفتاب کے ساتھ
ساحلِ شب پہ ڈوب جاتا ہے
ہر کرن منہ چھپا کے روتی ہے
شام کتنی اداس ہوتی ہے

خاص نمبر

رفعت سروش

نغمۂ تعمیر

(یہ نظم میرے منظوم ڈرامہ "نئی صبح" کا ایک حصّہ ہے آدمی اپنی فراست اور تہذیبی ارتقا کا نغمہ گا رہا ہے)
رفعت سروش

میں آدمی ہوں، میں آدمی ہوں، تمام مخلوق سے ہوں افضل
میں آفرینش کا شاہکار حسین، کروبیوں سے اجمل

زمیں کی جنت کی نعمتوں کو میں اپنے دامن میں بھر چکا ہوں
سنہرا گیہوں
کہ جس کے خوشوں میں دل دھڑکتا ہے زندگی کا
سفید چاول
کہ جس کی بالوں میں ایک نغمہ ہے سرخوشی کا
رسیلے پھل
اور مہکتے پھولوں کے شوخ جھرمٹ
کہ جن کے ہاتھوں میں کیف آگیں چھلکتے ساغر ہیں بیخودی کے

○

زمیں کے سینے کو چیر کر میں چھپے خزانے نکال لایا
دمکتے ہیرے
زمیں کی انگشتری میں ہنستے ہوئے نگینے
سنہرا سونا
کہ جیسے سورج کی شوخ کرنیں
حسین چاندی
کہ چاندنی مسکرا رہی ہو

چمکتا برق

کہ جیسے پانی میں نرم و نازک حسین تارے
ہزار دعائیں کہ جن سے میری حسین محفل سجی ہوئی ہے

○

سیاہ لوہے کی وہ جلادی کہ داغ فولاد بن گیا ہے
لچکتی تلوار بن گیا ہے
لچکتی تلوار میری عظمت

مری فراست

مری شجاعت
مری شجاعت نے ایک تلوار سے ہزاروں قتل کئے ہیں

مہیب جنگل

اور ان کے سائے میں پلنے والے درندے، انسان کے خون کے پیاسے
زمیں سے سر اٹھانے والے تمام موذی

○

ابھی یہ تلوار ہاتھ میں ہے
میں فاتح عظمت زمیں ہوں
زمیں کی پنہائی میری جنت
زمیں کی دولت مرا خزانہ

مرے تدبر نے علم و فن سے ہزار جادو جگا دیئے ہیں
کہ ایک فولاد سے جہاں میں ہزار نقشے بنا دیئے ہیں
یہ کارخانوں کے دل کی دھڑکن، یہ گنگناتی ہوئی مشینیں
مرے تصرف میں سیل دریا ہیں، بجلیاں میری دسترس میں

ہوا کی زلفیں ہیں میرے ہاتھوں میں میرا بازیچہ عرش اعظم
فضا میں پرواز کر رہے ہیں مرے تدبر کے نقش محکم
سمندروں کی حسین رگوں سے چن کے لایا جمیل موتی
حقیر "ایٹم" کا راز پا کر جبین تعمیر کو جلا دی

مرے لبوں پر ہیں امن عالم کے، جوش تعمیر کے ترانے
مرے تدبر کی برق کی زد میں فتنہ و شر کے آشیانے

احمد ریاض

ادب اور عقائد

کاکل و زلف کی زنجیر میں حدت ہی سہی — چشم و ابرو کی حکایات میں جدت ہی سہی
نغمہ و لے کی مچلتی ہوئی رعنائی میں — ایک بھرپور مہک ریز نفاست ہی سہی
شمع پر جلتے ہوئے پروانوں کا اک رقصِ وداع — کسمساتا ہوا اندازِ محبت ہی سہی
نرم پھولوں سے سبک سینوں پہ بھونروں کا خرام — جھلملاتا ہوا احساسِ عقیدت ہی سہی
میکدے میں مئے و مینا کا خروشِ پیہم — میگساروں کے لئے باعثِ رحمت ہی سہی
مسکراتے ہوئے ساقی کی ہر اک جنبشِ لب — گیت میں ڈھلتی ہوئی ایک حلاوت ہی سہی
چند یادیں مری گم گشتہ محبت کا بھرم — کسی رخ کسی مہوش کی امانت ہی سہی
ایک آنچل کی دمک ایک دریچے کا سکوت — تشنہ امیدوں کی ناکام حکایت ہی سہی

پھر بھی ماحول سے بچ کر مرے اشعار کا حسن — کسی پازیب کی جھنکار نہیں ہو سکتا
تم یہ کہتے ہو ادب خالقِ حالات نہیں — شعر ماحول کی للکار نہیں ہو سکتا
فکر کو واسطہ کیا جورِ شہنشاہی سے — علمِ انصاف کی تلوار نہیں ہو سکتا
ذہن کیوں کشمکشِ زیست کا رونا روئے — فن کبھی برسرِ پیکار نہیں ہو سکتا
تم یہ کہتے ہو کہ دنیا ہے فقط نسل کا کھیل — موت کی ضرب سے انکار نہیں ہو سکتا
آدمی کیا ہے سمندر میں فقط قطرۂ آب — اور قطرہ کبھی منجدھار نہیں ہو سکتا
تم یہ کہتے ہو ادب اور سیاست کا ملاپ — فن کی تعمیر کا معیار نہیں ہو سکتا
تم یہ کہتے ہو کہ ذکرِ لب و گیسو کے بغیر — نعرہ زن ہوگا پہ فنکار نہیں ہو سکتا

لیکن اے موت کو تخلیق سمجھنے والو — میرا فن موت کے صحرا میں نہیں گا سکتا
جب حقیقت کی کرن پھوٹ رہی ہو ہر سمت — میرا فن صرف فسانے نہیں دہرا سکتا
مرا ہر شعر ہے آدم کے تقاضوں کا امیں — میرا فن جاگتی تاریخ کا پیغمبر ہے
میں نے عنوان بنایا ہے اسی دنیا کو — میرا بیدار قلم وقت کا صورت گر ہے
لب و گیسو، مئے و مینا کے قصیدہ خوانو — زندگی کاکل و رخسار، مئے و رنگ نہیں
زندگی موت کی تقدیر بدل سکتی ہے — زندگی جہدِ مسلسل ہے رگِ سنگ نہیں
آدمی وقت کا بے خوف نمائندہ ہے — آدمی دہر کی حالت کو بدل سکتا ہے
آدمی زعمِ مشیت کو بھلا کیوں مانے — آدمی زعمِ مشیت کو بدل سکتا ہے

مرے مخصوص عقائد ہیں ادب سوز اگر

مری روداد اگر قابلِ اظہار نہیں
پھر میں خاکم بدہن تم سے یہ کہہ سکتا ہوں
اپنی تاریخ سخن میں کوئی فن کار نہیں
سعدیؔ و رومیؔ و جامیؔ کے ادب کی معراج
کیا فقط کوششِ اظہارِ حقیقت ہی نہ تھی
شبلیؔ و حالیؔ و اقبالؔ کے فن کا مقصود
کیا فقط چند عقائد کی اشاعت ہی نہ تھی

بائیسویں سالگرہ کا گیت

کام کرودھ کی لیک مٹاؤ

کام کرودھ کی لیک

چاہے ایک ہزار سال تک پوتھی پڑھے بکھانو
پریم آگ میں پگھلے ناہیں، جی کو پتھر جانو
صاحب کے گُن بھرے نام کی لو سنتن سے بھیک

مٹاؤ ـــ کام کرودھ کی لیک

دیا مِلے نہ بن ماٹی ہوئے، رام مِلے نہ بن پوجا
بھگتی پانا سہل نہیں ہے، فکر کرو تم دوجا
سادھ سنگت سے رتی مِلے ہے یہ سنتوں کی سیکھ
مٹاؤ ـــ کام کرودھ کی لیک

آشا گھیر کے لے جائے تو کام بگاڑے آدا
کرودھ کروپ میں دِشٹ دیکھے، آپ کرے ہٹ دعوا

کام کرودھ کا کام ہی جب ساجن ہو نزدیک
مٹاؤ ـــ کام کرودھ کی لیک

مظفر علی سید

اثر لکھنوی

آپ سے گزرنا ہے انتظارِ ہستی میں
اور کچھ اضافہ کر اعتبارِ ہستی میں

موج کی روانی پر انحصار دریا ہے
اضطراب پیدا کر انتشارِ ہستی میں

فکر عافیت کیوں ہے، خواہشِ سکوں کیسی
ترجمانِ طوفاں ہو جہد زارِ ہستی میں

ہمکنارِ منزل ہیں رہروانِ بے جادہ
اور ہم کہ الجھے ہیں خلفشارِ ہستی میں

آنکھ جس طرف اُٹھے اک جہانِ دیگر ہو
چاہیے نظر ایسی جلوہ زارِ ہستی میں

تم جنوں سمجھتے ہو ہم بہار کہتے ہیں
عشق کی گل افشانی خارزارِ ہستی میں

نالہ خونچکاں ہو کہ گلفروشِ نغمہ ہو
رنگ اس قدر بھر دے تار تارِ ہستی میں

غم بھی ہے نشاط افزا شرطِ استواری ہے
آپ بن حریف اپنا کارزارِ ہستی میں

جو ہے محو خود بینی، جو ہے نفس کا بندہ
فرق اثر نہ کیوں آئے پھر وقارِ ہستی میں

معین احسن جذبی

ابھی زمین حسیں ہے نہ آسماں حسیں
ابھی بنی ہی کہاں ہے مری بہشت بریں

ابھی ہے ذوقِ جنوں اپنا مصلحت آگیں
اِدھر بھی ایک نظر اے نگارِ قصہ جبیں

یہ اہتمام یہ تیاریاں تباہی کی
عرق عرق ہوئی جاتی ہے زرفشاں سی جبیں

تمہیں ستم کا ازل ہی سے حق سہی لیکن
یونہی رہیگا کوئی تابکے ملول و حزیں

ہے اس کا صید زمانہ کا ایک اک صیّاد
فقط فضاؤں میں اُڑتا نہیں مرا شاہیں

چمن پہ گذری سو گذری مگر یہ کیا کم ہے
کہ فاش ہو گئے جھوٹی بہار کے آئین

چمن پرستوں کو مژدہ چمن کی لوٹ کیسا تھا
الجھا جاتا ہے کانٹوں میں دامنِ گلچیں

احمد ندیم قاسمی

بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے
ہجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

ترے جمال کی نکہت سے چونکتا ہے دماغ
مہک مچل کے مرا صبر آزماتی ہے

بہ فیضِ لذتِ تخلیق، خون ہو کے کلی
خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

وفورِ رنگ میں گھلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گل کو اگر آئینہ دکھاتی ہے

یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے شرما کر
نگارِ شام حیا سے لپٹ گراتی ہے

یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات
چٹک کلی کی، ستاروں کو گدگداتی ہے

یہ رودِ آب، یہ تارے، یہ شہرِ لالہ و گل
ابھی وہ آ نہ چکے اور رات جاتی ہے

احمد راہی

رہزن دلوں کے، دل کے نگہبان ہو گئے
عقدے مری حیات کے آسان ہو گئے

پھوٹے ہیں آ کے آبلے پاؤں کے کس جگہ
جب دامنوں کے چاک گریبان ہو گئے

کچھ بھی ملا نہ اپنی وفا کا انھیں صلہ
جو لوگ تیرے نام پہ قربان ہو گئے

کتنے ہی خوش نصیب تھے وہ اہلِ انجمن
جو ایک ہی نظر میں تری جان ہو گئے

اب ساکنانِ محبس و زنداں کو کیا خبر
کتنے صنم کدے یہاں ویران ہو گئے

جن کے سہارے ہم نے گزاری شبِ فراق
راہیؔ وہ سارے خواب پریشان ہو گئے

نظر حیدرآبادی

علاج قسمتِ آدم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
بہر عالم سپاسِ غم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

سکوں کی آرزو عیبِ مستقل آزار ہے یارب
مزاجِ زندگی برہم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

غریبوں نے کبھی بابِ اثر کھلتے نہیں دیکھا
دعاؤں پر توجہ کم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

خودی منجملۂ اسبابِ ایماں ہوتی جاتی ہے
جبینِ خواجگی کو خم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

یہ ذوقِ کیف و مستی ورنہ خسرو نہیں ساقی
ہر اک پیالے کو جامِ جم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

نظرؔ اب یادِ یارانِ وطن بھی بار ہے دل پر
محبت کو بھی نذرِ غم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

نور بجنوری

مجھے تو صرف یہ کہنا ہے شہریاروں سے
کہ اب یہ قصر ٹھہرتے نہیں سہاروں سے
ہمارا جذبۂ پرواز کون چھینے گا
ہماری خاک بھی الجھے گی کوہساروں سے
روش روش پہ ہیں خونِ بہار کے دھبے
چمن چمن کو گلہ ہے خزاں تنکاروں سے
رخِ حیات کی زردی بھی ہے نگاہوں میں
ہمیں بھی رنۂ عقیدت ہے گلعذاروں سے
فریبِ وعدۂ فردا نہ کھاؤ دل والو
نظر کے گھاؤ بہلتے نہیں ستاروں سے
ہے انکے پاس ہر اک چیز زندگی کے سوا
مرا سلام کہو فن کے سوگواروں سے

اختر ہوشیار پوری

کون اٹھا ہے زلفیں بکھرائے
دور تک نرم سائے لہرائے
ہم کو گلشن سے کد نہیں ہے اگر
نکہت گل سے انکی یاد آئے
آ بھی جاؤ کہ پھر یہ وقت کہاں
اجنبی اجنبی کو اپنا لے
بڑھتی جاتی ہے دھوپ عالم میں
ہائے اس زلف کے خنک سائے!
تم کہاں ہو حزیں حزیں کلیو
موسم گل کے دن پلٹ آئے
جانے وہ کیا مقام تھا کہ جہاں
تیرے ہوتے بھی پاؤں تھرائے
یہ تو میرا سیاہ خانہ ہے
زاہدو تم ادھر کہاں آئے
تیری نظروں کی بات رکھنے کو
ہم نے اکثر فریب بھی کھائے
واقعہ ہے کہ تیرے لطف کرم
ہم کو تیرے ستم بھی یاد آئے
کٹ ہی جائیں گی غم کی زنجیریں
دل سے اختر کہو نہ گھبرائے

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

کبھی تو آئے گی یہ اعتبار کیا کم ہے
تمہیں کہو کہ خیال بہار کیا کم ہے

اگر نہ سمجھیں تو زیر کمر ہے دست رفیق
اگر وہ سمجھیں تو یہ گیرو دار کیا کم ہے

اگر نہ دیکھیں تو ہے رنگ و بو کی طغیا نی
اگر وہ دیکھیں تو زخم بہار کیا کم ہے

بنے نہ کچھ بھی تو پھر گرد کارواں ہی نہ ہو
کہ راہ شوق میں موجِ ۔ غبار کیا کم ہے

بنے گی آرزو تیری کبھی تری تقدیر
ہزار جبر سہی اختیار کیا کم ہے

مری وفا مجھے رخصت نہ دے سکی مسعود
مرے کنار میں ورنہ فشار کیا کم ہے

(لندن سے)

رابعہ خاتون نہاں

اتنا بھی نہ زیر بار کرنا
ہستی سے نہ شرمسار کرنا

مر کر بھی نہ کم ہو بیقراری
اتنا تو نہ بیقرار کرنا

دیوانہ ہے جانے کب مچل جائے
اس دل کا نہ اعتبار کرنا

رسوا نہ ہو راز عشق اے دوست
آنکھوں کو نہ اشکبار کرنا

خاموش ہے شکوہ سنج الفت
اب عذرِ جفا ہزار کرنا

دامانِ وفا کو خون دل سے
یکسر ہمیں لالہ زار کرنا

ہر دم، دمِ واپسیں ہے اے دوست
اب میرا نہ انتظار کرنا

موت اچھی ہے ایسی زندگی سے
اے طولِ غم اختصار کرنا

وابستگیٔ غمِ نہاں سے
تم خود کو نہ سوگوار کرنا

افضل پرویز

چپکے چپکے جاگ رہی ہے یاد کسی کی
یادیں لہریں لیتی ہے بیداد کسی کی
جھانجھن کی جھنکار میں نغموں کے طوفاں ہیں
کس نے سنی ہے کون سنے فریاد کسی کی
محلوں والی شہزادی کے عیش سلامت
اس کی بلا سے دنیا ہو برباد کسی کی
رات کی رانی جیسے نس نس میں بس جائے
یوں احساس پہ چھا جاتی ہے یاد کسی کی
گلبن گلبن موجِ نسیم کی مست خرامی
یا موضوعوں میں فکرِ آزاد کسی کی
دیوانے کو مت چھیڑو اس وقت نہ جانے
کون سی دھن میں ہے طبعِ ناشاد کی

جمیل ملک

آپ نے دل میں ہی چھپالی ہے
ہم نے نظروں سے بات پالی ہے
اس طرف بوند بھی نہیں آئی
کس طرف تم نے مے اچھالی ہے
کیا کوئی ہے جواب اُن کے لئے
جن کی اِک اِک نظر سوالی ہے
وہ بھی اپنے لئے بہار نہیں
خون سے جو بہار پالی ہے
نگہِ دوست کیا کیا تو نے؟
غیرتِ عشق پیچ ڈالی ہے؟!
مسکرا، تو بھی میرے دل کی کلی
زندگی مسکرانے والی ہے
کیا کریں حسنِ دوست کی باتیں
دل پریشاں ہے ذہن خالی ہے
آج تو راز کھل چلا تھا جمیل
بڑی مشکل سے بات ٹالی ہے

عابد حشری

بھول جانا نہ کہیں تم مجھے اپنا کہہ کے
رہ نہ جائے مرے احساس کا سورج گہہ کے
اے نئے مستی و سرمستیٔ پندارِ جمال
اب جوانی کے قدم پڑتے ہیں بہکے بہکے
آج میں گردشِ دوراں کا اڑاؤں گا مذاق
مسکراؤں گا غمِ زیست کو اپنا کہہ کے
کاش ماحول پہ بکھرا ہے رومانِ حیات
میں بھی مہکوں مرے خوابوں کی دلہن بھی مہکے
اب نہ رعنائیٔ تخئیل نہ احساس جواں
زندگی بھول گئی ہم سے بہت کچھ کہہ کے
اف یہ مرجھائے ہوئے پھول یہ مسکی کلیاں
اسپرِ یہ جبر کہ دوشیزۂ گلشن مہکے
چھٹ گئے کشمکشِ بیم و رجا سے حشری
کتنے آسودہ ہیں ناکام تمنا رہ کے

عابد حسن منٹو

بھول گئے ہم چاند ستارے
آپ ہمیں کتنے ہیں پیارے
ساتھ رہے گر آپ ہمارے
موڑ ہی لیں گے زیست کے دھارے
للہ آپ نہ آنکھیں پھیریں
آپ کی نظریں میرے سہارے
فکرِ زمانہ کون کرے گا
ساتھ ہیں جب تک آپ ہمارے
نقش دیئے جو زیست کے غم نے
آپ کے غم نے اور ابھارے
صبح آپ سے ملنا ٹھہرا
عابد کیسے رات گذارے

اپنا گھر

کرشن چندر

راگھوراؤ کال کوٹھری کی تاریکی میں اپنی آدرشی جذباتیت پر مسکرایا جس نے اسے "سوریہ پیٹ" سے بھاگ جانے پر مجبور کیا، سری پورم سے وہ سوریہ پیٹ بھاگا، سوریہ پیٹ سے بھاگ کر حیدرآباد چلا آیا اور یہاں آکر رکشا چلانے لگا۔ کیونکہ اس کے بازو مضبوط تھے، اس کا سینہ مضبوط تھا اس کی ٹانگیں مضبوط تھیں اور وہ بے تکان چڑھائی چڑھ جاتا تھا اور اسی آسانی سے اتر آتا تھا پہلے پہل اسے کنکریٹ کی سڑک پسند آئی بجلی کی روشنی پسند آئی اور رکشا کی گھنٹی پسند آئی، رات کو اسے پیٹ بھر کھانا کھا کر نیند آ گئی، تو اس نے سوچا کہ اسے منزل مقصود مل گئی، رکشا کے مالک نے اسے دو وردیاں بھی سلا دیں تو وہ سب کچھ بھول گیا اور مزے سے پانچ چھ مہینے تازی کتے کی طرح حیدرآباد کی سڑکوں پر دوڑتا رہا وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایک انسان ہے جسے ایک گھوڑے کی طرح جوتا گیا ہے وہ یہ بھول گیا کہ کچھ لوگ ہمیشہ رکشا میں سوار ہونے میں کچھ لوگ ہمیشہ رکشا چلاتے ہیں وہ یہ بھول گیا کہ وہ کس مقصد سے آیا تھا، دو کپڑے، دو وقت کا کھانا اور چند روپیوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک خوش رنگ جھلی باندھ دی تھی اور جس دن اس نے اپنے باپ ویریا کو بیس روپے بھیجے اس روز ایسا خوش نصیب آدمی سارے حیدرآباد میں کوئی نہ تھا پھر بیڑی کا مزہ بہت عمدہ تھا، سگریٹ کا مزہ اس سے بھی عمدہ تھا اور گوشت کا مزہ سب سے عمدہ تھا۔

پانچ چھ مہینے اسی مسرت میں گذرے پھر وہ بیمار پڑ گیا اس کا خیال تھا کہ وہ وقتاً بیمار ہوا تھا مگر ایسا نہیں تھا پہلے پہل اسے چڑھائی چڑھتے ہوئے ایک روز چکر آیا وہ بڑی مشکل سے سنبھلا تھا۔ پھر ایک دن ہلکی سی کھانسی کا دورہ پڑا تھا پھر ایک روز اسے بخار ہوا تھا معمولی سا بخار پھر یکایک وہ ایک مہینے کے لئے بیمار پڑ گیا۔ اس دوران میں رکشا کے مالک نے اسکی خدمت کی تھی کیونکہ وہ مالک کا سب سے اچھا رکشا چلانے والا تھا اور پھر راگھوراؤ نے بھی کچھ پیسے بچا رکھے تھے وہ اس بیماری میں اس کے کام آئے اور وہ ایک مہینے کے بعد اچھا ہو گیا۔ مگر ابھی تک بدن میں نقاہت باقی تھی وہ پھر ہولے ہولے رکشا چلانے لگا، مگر ہولے ہولے اور تھوڑا تھوڑا کھانستے ہوئے ڈاکٹر نے اسے دو مہینے مزید آرام کرنے کو کہا تھا۔ مگر وہ کام نہیں کرے گا تو کھائے گا کہاں سے؟ اس لئے رکشا چلانا ضروری تھا گو اب دم پھولتا تھا اور ماتھے اور سارے جسم پر پسینہ آجاتا تھا اور رگیں دوران خون سے گویا پھٹنے لگتی تھیں اور پسپھڑوں میں کبھی کبھار کھانسی کے دھوئیں کی طرح بگولے بل کھاتے تھے۔ مگر رکشا چلانا ضروری تھا۔ تاریکی پھر لوٹ آئی تھی۔ راگھوراؤ سوچتے سوچتے رک گیا، اس نے ایک جھلستی نگاہ اس تمام ہجوم پر ڈالی جو اس کی رکشا میں سوار ہوا تھا، کلرک جو ایک آنے کے لئے جھگڑتے تھے، طالب علم جو رکشا تیز چلانے پر مصر تھے غنڈے جو رات کی تاریکی میں چھرے لے کر گھومتے تھے، عاشق جو سینما کا پردہ کھینچ کر رکشا کا پردہ کھینچ لیتے تھے اور آبروباختہ عورتوں سے لپٹ کر پیار کرتے تھے اور جب وہ رکشا چلاتے چلاتے کھانستا تھا تو اسے گندی گالیاں دیتے تھے یا اس کی رکشا سے اتر کر اسے پیسے دیئے بغیر دوسری رکشا میں سوار ہو جاتے تھے

مولوی جو رکشا کو بند گاڑی کی طرح استعمال کرتے تھے، کھدر پوش جو رکشا سے بیک وقت ان کا کام لیتے تھے، بنئے جو رکشا کو مال گاڑی سمجھتے تھے، عورتیں جو رکشا کو بچوں کا یتیم خانہ سمجھتی تھیں کیسی کیسی مضحکہ خیز صورتوں سے راگھو راؤ کو پالا پڑا تھا، گاؤں میں راگھو راؤ نے غم کھانا سیکھا تھا، یہاں شہر میں آ کے راگھو راؤ نے غم کھا کے مسکرانا سیکھ لیا اور دوسروں پر مسکرانا اور اپنے اوپر ہنسنا سیکھ لیا۔

پھر راگھو راؤ نے اس تمام ہجوم پر ایک نظر ڈال کر اس میں سے ایک آدمی کا انتخاب کیا۔ یہ آدمی ایک روز عابد علی روڈ سے رات کو (۹) بجے اس کی رکشا میں سوار ہوا تھا اس کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں، اس کے لہجہ میں شائستگی تھی جس طرح اس نے رکشا والے کو اپنے پاس بلایا اس میں نہ کوئی تنفر تھا نہ قربت بہت اچھا انداز تھا۔ سفر کے دام بھی اس نے خود ہی بتلا دیئے تھے جو نہ زیادہ تھے نہ کم۔ بالکل واجب تھے اس لئے اس بات پر بھی کوئی جھگڑا نہ ہوا راستہ چلتے ہوئے بھی اس آدمی نے کوئی بات نہیں کی، ورنہ رکشا والے سے اکثر آدمی ایسے بے ڈھب سوال پوچھتے ہیں اور سوال پوچھتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچتے کہ رکشا والے کے پاس سانس کم ہوتا ہے کہ وہ اسے بیک وقت رکشا چلانے اور باتیں کرنے میں صرف نہیں کر سکتا۔ وہ یا تو باتیں کر سکتا ہے یا پھر رکشا چلا سکتا ہے اس لحاظ سے بھی یہ آدمی بہت اچھا تھا، آدھا سفر اسی خاموشی میں کٹ گیا۔

اس کے بعد ضیائی روڈ کا ناکہ آگیا تو اس آدمی نے آہستہ سے کہا، یہاں سے اختر روڈ کی طرف چڑھنا ہے لمبی چڑھائی تھی راگھو رام کا دم پھول گیا رگیں ابھر آئیں اور پھر وہی کھانسی کا چکر چلا۔ اس آدمی نے بڑی نرمی سے کہا رکشا روک لو۔

راگھو راؤ نے کہا نہیں صاحب فکر نہ کیجئے ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا میں آپ کو لے چلتا ہوں۔

اس آدمی نے نرمی سے لیکن کچھ سختی سے کہا رکشا روک لو۔ راگھو راؤ نے رکشا روک لیا، اس نے سوچا اب یہ آدمی مجھے گھور کر یا شاید ایک آدھ گالی دے کر رخصت ہو جائے گا اور میرا کرایہ بھی مارا جائے گا۔ مگر اس آدمی نے ایسا نہیں کیا وہ راگھو راؤ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ چڑھائی تم خالی چل سکو گے نا۔ آگے جا کے میں پھر سوار ہو جاؤں گا۔

راگھو راؤ نے چلتے چلتے تشکر آمیز نگاہوں سے اس آدمی کی طرف دیکھا اس آدمی کے سیاہ چہرے پر دو بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ہمدردی جھانک رہی تھی۔ ہمدردی، سمجھ اور وقار ایک عجیب طرح کی قربت اور دوری۔

اس آدمی نے پوچھا کب سے کھانسی ہوتی ہے؟

ایک مہینے سے۔

کہاں رہتے ہو؟

گوبند رام کے باڑے میں۔

یونین کے ممبر ہو ـــــ!

کیا؟ راگھو راؤ کو سوال سمجھ میں نہ آیا۔

وہ آدمی چند لمحے خاموشی سے راگھو راؤ کے پاس چلتا رہا۔ پھر آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا جیسے تم رکشا چلانے والے ہو ایسے اس شہر میں دوسرے رکشا چلانے والے بھی ہیں سب کی تکلیفیں ایک طرح ہوتی ہیں اس لئے سب کا علاج بھی ایک طرح کا ہو سکتا ہے، اسی لئے رکشا چلانے والوں نے اپنی ایک

یونین بنا رکھی ہے جہاں سب رکشا چلانے والے مل کر بیٹھتے ہیں۔

راگھو راؤ نے اپنے ساتھ چلنے والے آدمی کو بڑے شبہ سے دیکھا۔ اس کے ذہن میں سور بہ پیٹ کے ٹکروں کی ٹولی گھوم گئی۔ جہاں سب لوگ مل کر بیٹھتے تھے اس نے خفا ہو کر اس آدمی کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا دیا اور بولا نا صاحب میں کسی ٹولی کا ممبر نہیں ہوں نہ ممبر بننا چاہتا ہوں۔

وہ آدمی کچھ اور دیر خاموشی سے راگھو راؤ کے ساتھ چلتا رہا پھر اس نے اور ہی طرح کے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ راگھو راؤ کا نام، وہ کہاں سے آیا تھا، رکشا چلانے میں کیسے دم پھولتا ہے، اترائی میں رکشا کیسے اتارنا چاہیئے، سستا کھانا کہاں ملتا ہے، سستا مکان کہاں ملتا ہے، جو مالک کھانا اور کپڑا اور مکان دیتے ہیں وہ کتنی رقم رکشا والے کی محنت سے وصول کر لیتے ہیں، بڑے کام کی باتیں تھیں وہ۔ راگھو راؤ بڑے انہماک سے سنتا رہا، چلتے چلتے اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ چڑھائی کب کی چڑھ آیا ہے، کتنے ہی نکڑ کے گلیاں اور بازار اس کے سامنے سے گزر گئے۔ —— اور اب گفتگو کرتے کرتے اس آدمی کے گھر تک آن پہنچے —— اور راستے میں وہ آدمی ایک منٹ کے لئے بھی اس کی رکشا پر سوار نہیں ہوا۔ اپنے گھر پہنچ کر اس آدمی نے راگھو راؤ کو پیسے دیئے پھر اس نے کہا ایک پیالہ چائے پی کے جاؤ۔

راگھو راؤ نے انکار کیا۔

نہیں نہیں آؤ۔ اس وقت بہت سردی ہے ایک پیالہ چائے پیو گے تو جسم میں گرمی اور تازگی آجائیگی اتنا کہہ کے اس نے راگھو راؤ کا ہاتھ پکڑ لیا، اور اسے اپنے گھر کے اندر لے گیا۔

راگھو راؤ نے دیکھا کہ گھر چھوٹا سا گھر ہے۔ لیکن بہت صاف ستھرا ہے دو کمرے ہیں ایک کمرہ جس میں وہ داخل ہوا، دوسرا اس کے اندر، دونوں کے بیچ ایک پھولدار پردہ تھا، کمرے کے باہر تین کرسیاں پڑی تھیں جن پر گدے چڑھے تھے ایک لمبا سا بنچ تھا، اس پر بھی ایک نیلا گدا پڑا تھا، فرش پر پھولے رنگ کی دری تھی۔ اور چاروں طرف لکڑی کے ریکوں میں کتابیں پڑی تھیں ابھی وہ یہاں تک دیکھ پایا تھا کہ اندر کے کمرے سے پھول دار پردے کو ہٹا کر ایک دبلی پتلی سانولی لڑکی نکل آئی، اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی بھی بھاگتی ہوئی آئی اور آتے ہی اس آدمی کی ٹانگوں سے لپٹ گئی جو راگھو کو یہاں لایا تھا۔

اس آدمی نے مسکرا کر کہا میرا نام مقبول ہے یہ میری بیوی ہے یہ میری بچی ہے آمنہ۔ پھر اس نے آمنہ کو گود میں لے کر کہا، یہ ہمارا ساتھی راگھو راؤ ہے اسے سلام کرو بیٹا ان کی گود میں جاؤ آمنہ نے اپنے ننھے ننھے بازو راگھو راؤ کی طرف بڑھا دیئے۔ راگھو راؤ نے بڑی حیرت اور مسرت سے آمنہ کو اپنی گود میں لے لیا، آمنہ اس کے بازوؤں میں آکر بولی۔ ساتھی لال سلام۔

راگھو راؤ نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا آمنہ کی طرف، مقبول کی طرف، مقبول کی بیوی کی طرف، لیکن ان سب کی نگاہوں میں ایک ایسا انوکھا پیار تھا، ایک ایسی گہری ہمدردی اور رفاقت تھی چہروں پر ایسی معصوم مسکراہٹ تھی جو اسے آج تک کہیں نہیں ملی تھی ان کے چہروں کو ایک لمحہ حیرت سے دیکھ کر گو اسے یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ لال سلام کس کو کہتے ہیں لیکن ان مسرت بھرے چہروں سے اس نے اتنا اندازہ لگا لیا کہ یہ لال سلام کوئی اچھی چیز ہی ہو گی، اس لئے اس نے جھجکتے جھجکتے کہا لا۔ل۔ سلا۔م

آمنہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، مقبول کی بیوی بھی ہنسی، مقبول بھی مسکرایا اور پھر ایک گدی دار کرسی پر بیٹھ کر اپنی

بیوی سے کہنے لگا یہ ساتھی اس وقت کھانا یہیں کھائیں گے۔

راگھو راؤ نے پھر حیرت سے مقبول کی طرف دیکھا مگر اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان پر چینی کے صاف ستھرے برتنوں میں سب نے مل کر کھانا کھایا۔ آمنہ راگھو راؤ کی گود میں بیٹھی تھی اور اس سے اس طرح لقمے طلب کرتی تھی جیسے وہ بچپن میں اپنے باپ سے لقمے مانگا کرتا تھا۔ اسے ان ننھے ننھے ہاتھوں کی طلب بہت پیاری معلوم ہوئی۔ مقبول کی بیوی ثریا کا اس کی پلیٹ میں بار بار گوشت کا کوئی اچھا سا ٹکڑا ڈال دینا بہت بھلا لگا۔ مقبول چپکے سے کھانا کھاتا رہا، راگھو راؤ اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا، ساتھی کسے کہتے ہیں لال سلام کا کیا مطلب ہے اور سب سے بڑھ کر اس محبت اس خلوص اس رفاقت کا کیا مطلب ہے وہ یہ سب جاننا چاہتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ثریا نے دسترخوان ہٹایا اور اس کے لئے نرم گرم قہوہ کی ایک پیالی لے آئی۔ قہوہ پی کر راگھو راؤ نے مقبول کی طرف دیکھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مقبول نے کہا جب تک تمہیں کھانسی کی شکایت ہے تمہیں رات کو کام نہیں کرنا چاہیے۔

راگھو راؤ چپ رہا۔

مقبول بولا ہماری یونین کا ایک ڈاکٹر ہے تم اس سے علاج مفت کروا سکتے ہو۔

راگھو راؤ چپ رہا۔

مقبول بولا۔ اتنی سردی میں تم باڑے جا کر کیا کرو گے۔ یہیں سو رہو۔

یکایک راگھو راؤ نے پوچھا۔ ساتھی کا کیا مطلب ہے۔

مقبول آہستہ سے اپنی کرسی سے اٹھا، اس نے ثریا سے کہا۔ ثریا ساتھی آج یہیں سوئے گا۔

ثریا نے اندر سے بستر نکالا اور اسے بھوری دری پر بچھا دیا۔ مقبول نے کتابوں کے ریک سے ایک کتاب انتخاب کی اور پھر راگھو کے پاس آبیٹھا، دونوں نے لحاف اوڑھ لیا۔ ٹیبل لیمپ کی سلائے دار روشنی میں مقبول نے کتاب کھولی، راگھو راؤ نے بے اختیار کتاب کے چکنے صفحوں کو ہاتھ لگا دیا، مقبول نے کتاب اس کے آگے کر دی راگھو راؤ نے بڑی محویت کے عالم میں کتاب کے چکنے چکنے صفحوں پر ہاتھ پھیرا، الفاظ تو پڑھ نہ سکتا تھا لیکن ہاں کاغذ کا لمس، رنگین ریشم کے لمس کی مانند تھا اس نے آہستہ سے کتاب مقبول کے ہاتھ میں دیدی۔

مقبول نے کتاب کھولی ایک صفحہ پر دنیا کا نقشہ بنا ہوا تھا، مقبول نے پہلے اپنے ملک پر انگلی رکھی اور کہا۔ یہ ہندوستان ہے ہمارا دیس۔ پھر اوپر شمال کی طرف ایک ملک پہ انگلی رکھی اور کہا آج سے تیس سال پہلے یہ ملک بھی ہمارے ملک کی طرح دیوؤں کا ملک تھا۔

رات بہت گہری تھی کہانی بہت لمبی تھی لیکن اس رات کا ایک ایک لمحہ اور اس کہانی کا ایک ایک لفظ راگھو راؤ کے لئے قیمتی تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے چندری کے پاکیزہ سینے میں جس نخل نوبہار کا پرتو دیکھا اس کی جھلک ان لفظوں میں موجود ہے اپنے سینے میں وہ صدیوں کی ان بجھی پیاس لے کے آیا تھا۔ اس کی سیرابی یہاں ناممکن ہے بنکو کی جس پرشکوہ محراب نے اس کا سر جھکا دیا تھا اس سے بڑی بڑی محرابیں دلی کی قوت عمل نے جھکا ڈالی ہیں الفاظ مقبول کے دل سے نکل رہے تھے اور راگھو راؤ کے دل میں اترتے جا رہے تھے اور یہ کی کوئی طاقت نہ تھی جو انہیں روک سکتی۔ راگھو راؤ کو بہت ملی تھی اس نے رستہ پا لیا تھا، پہلے جس چیز کا کوئی مطلب نہ تھا۔ آج اس میں اسے

معنی نظر آئے جہاں اندھا تجربہ تھا وہاں روشنی کی لہر دوڑنے لگی، جہاں اس احساس کو کنارہ نہ ملتا تھا وہاں اسے مضبوط دھرتی نظر آئی اور راگھو راؤ نے بڑی مضبوطی سے اس دھرتی پر اپنے قدم رکھ دیئے اور اپنے دل میں کہا میں جوان ہوں اور یہ جو کچھ میں سن رہا ہوں یہ بھی جوان ہے اسی لئے بیج بویا جائے گا اور فصل کاٹی جائے گی۔

اور راگھو راؤ کو آج تک بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس رات کب تک کھیتی دیر تک جاگتا رہا کب سویا، اسے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ اور مقبول دونوں لحاف میں بیٹھے ہوئے تھے وہ سن رہا تھا اور مقبول سنا رہا تھا۔ اور قریب ہی فرش پر ایک طرف ثریا سو رہی تھی اور اس کے پاس ننھی آمنہ ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی اور اس کا ننھا سا ہاتھ بستر سے باہر نکلا ہوا تھا اور کمرے میں دھیمی لیمپ کی دودھیا روشنی دیوار کے سایوں میں لرز رہی تھی۔

اس کے بعد اسے یہ یاد نہیں کہ کب سویا صرف اتنا یاد ہے کہ بہت رات گئے یکایک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں لحاف سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور ثریا لحاف کو اس کے پاؤں میں موڑ رہی ہے لحاف کو موڑنے میں ثریا کی انگلیاں راگھو راؤ کے پاؤں سے چھو گئیں، اور جانے اس کے کن نازک سے احساسات کو ان انگلیوں نے چھو دیا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں اور اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ثریا کو اس کے بستر سے گھوم کے مقبول کے بستر کا لحاف ٹھیک کرتے ہوئے دیکھا پھر اپنی بچی کے بستر کی سلوٹیں دور کرتے ہوئے دیکھا پھر ایک اطمینان کا سانس لے کر ثریا اپنی آمنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سو گئی اور راگھو راؤ کی آنکھوں سے آنسو باہر چھلک آئے۔ لیکن راگھو راؤ نے ان آنسوؤں کو پونچھا نہیں کیونکہ یہ غم کے آنسو نہ تھے یہ خوشی کے آنسو تھے۔ آج وہ اپنے گھر آیا تھا۔

(ناول "جب کھیت جاگے" کا ایک حصہ)

●

لفظ اور کسان

"لفظ" بھی خوب چیز ہے۔ کسان کی زندگی اسی لفظ کے بھروسہ پر قائم ہے۔ جو کچھ اس کے منہ سے نکلا اسے پورا کر دیا۔ یہ کسان کی اجڈ، گنوار لیکن ذہانت سے بھرپور زندگی کا خاصہ ہے اسی غلطی میں کسان مارا گیا کہ اس نے بھی لالہ ہیرا لال ساہوکار کے ہر لفظ کو سچ جانا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لفظ خدا ہے، دیوتا ہے۔ وہ نیکی ہے اور حسن ہے اور عبادت ہے اور انسانیت ہے لفظ محبت کا پہلا بوسہ ہے اور سورج کا سونا ہے اور جھیل کا سکون ہے۔ لفظ عقیدہ ہے اور قربانی ہے اور فرشتوں کی سی پاکیزگی ہے۔ لفظ زندگی ہے اور محنت ہے اور رفاقت ہے لفظ ہمت کا سانس ہے اور بے تھوون کا نغمہ ہے اور شکنتلا کی نگاہ ہے لفظ توانائی ہے اور حرکت ہے سمندر کی موج ہے، امن ہے اور تاریخ کا انقلاب ہے۔ لیکن "لفظ" صرف امن ہی نہیں، وہ جنگ بھی ہے صرف نیکی ہی نہیں وہ بدی بھی ہے اور بددیانتی اور دشمنی اور کینہ اور بغض اور اندھا انتقام بھی ہے لفظ عداوت ہے اور جھوٹ ہے اور افترا ہے۔ لفظ اندھیرا ہے، موت ہے اور کبھی نہ مٹنے والی تاریکی ہے۔ لفظ سرمایہ پرستوں کی منی ہے۔ یتیم بچوں کا رونا ہے اور تاریخ سے غداری ہے، وہ کہانی کی لاش ہے گیت کا کفن ہے اور شاعری کا مزار ہے۔

کرشن چندر

ہم جلیس

خوبصورت بچے

چینی عوام کا کوئی مہمان جب چین میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی ملاقات چین کے بچوں سے ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم نے چین کے پہلے سرحدی ریلوے اسٹیشن شم شن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو نیلی پتلونوں، سفید قمیصوں اور سرخ اسکارفوں میں ملبوس چھوٹے چھوٹے چینی لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک گروہ نے مجھے گھیر لیا ان میں سے ہر ایک کے ہاتھوں میں پھولوں کے بوکٹ تھے، اپنے اپنے پھولوں کے بوکٹ مجھے دینے سے پہلے بڑے سپاہیانہ انداز میں وہ مجھے سلام کرتے، پھولوں کے بوکٹ دیتے اور پھر بڑی گرمجوشی سے اپنے ننھے ہاتھ ملاتے اور دوسرے ننھے ہاتھ کے لئے جگہ خالی کر دیتے۔

میں چین کے بچوں کے اس محبت آمیز اور گرم جوش استقبال کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ابھی میری نظروں کے آگے شم شن کا پلیٹ فارم، کینٹن، ہانگ کاؤ، اور پیکنگ کے ہوائی اڈے اور دیوار چین، کمڈن، ٹنٹسن۔ نانکنگ، شنگھائی اور ہانگ چاؤ کے ریلوے اسٹیشن پھیلے ہوئے ہیں، اور میری نظریں چینی بچوں کے شاداب چہروں اور ان کے بوکٹوں کے پھولوں سے رنگین ہوتی جا رہی ہیں اور غالباً ہمیشہ ہی رنگین رہیں گی۔

چین میں میں جہاں بھی گیا استقبال کرنے اور الوداع کرنے کے لئے چینی بچے سب سے پیش پیش ہوتے، چاہے میں صبح منہ اندھیرے کسی شہر کو چھوڑ رہا ہوں، چاہے کسی بہت ٹھنڈی آدھی رات کے وقت کسی شہر پہنچ رہا ہوں، چینی بچے نیند اور جاڑے دونوں کی پروا کئے بغیر ہنستے مسکراتے اور گاتے میرا خیر مقدم کرتے رہے اور مجھے الوداع کہتے رہے۔

میرا ہوائی جہاز زمین سے اونچا ہو رہا ہے۔ معصوم مسکراتے چہرے چیخ چیخ کر مجھے الوداع کہہ رہے ہیں۔ میری ریل پلیٹ فارم پر پہنچ رہی ہے چھوٹے چھوٹے ننھے ہاتھ پھولوں کی ڈالیوں کی طرح جھول جھول کر میرا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

ننھے بچوں کی اس بڑی محبت کے سامنے میں باوجود طویل القامت ہونے کے اپنے آپ کو بہت ہی پست قد سمجھتا ہوں۔

ہانگ چاؤ کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کا وہ واقعہ بظاہر معمولی سہی، لیکن میں اسے اپنی زندگی کا بہت ہی اہم اور یادگار واقعہ سمجھتا ہوں۔ ہم ہانگ کانگ چھوڑ رہے تھے۔ ایک دس سالہ لڑکی۔ چانگ سے چن، جس نے مجھے پھولوں کا بوکٹ دیا تھا، گاڑی کے روانہ ہونے سے ایک لمحہ قبل میرے پاس آئی اور پاکستان اور چین کے عوام کی دوامی دوستی کا نعرہ لگانے کے بعد مجھ سے بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ آپ چین کے عوام کی کوئی یادگار مجھ سے لے جائیں اور پاکستان کے عوام کی کوئی یادگار ہمیں دے جائیں۔"

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا دوں بلکہ اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا کہ اس نے کہا۔

"آپ کی ٹوپی پر امن کے کبوتر کا بیج لگا ہوا ہے۔ آپ وہ بیج مجھے دیدیجئے اور
میرا یہ بیج اپنی ٹوپی پر لگا لیجئے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے سرخ اسکارف سے سرخ ستارے کا بیج اتارا اور میرے کوٹ کے کالر پر لگا دیا اور میں نے اپنی ٹوپی سے امن کے کبوتر کا بیج نکال کر اس کے سرخ اسکارف میں لگا دیا، ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ لیکن ہاتھ ملاتے ہوئے جب اس نے یہ کہا تو میں دنگ رہ گیا۔ اس نے کہا۔ اس ۱۰ سالہ ننھی لڑکی نے کہا۔

"اس سرخ ستارے کی ضرورت وہاں ہے جہاں رات اندھیری ہے اور اس امن کے
کبوتر کی ضرورت وہاں ہے جہاں کوریا ہے۔"

گاڑی چل رہی تھی، اس لئے میں اس ننھی سی لڑکی سے نہیں پوچھ سکا کہ بتاؤ اتنی چھوٹی سی عمر میں تم اتنی بڑی بڑی باتیں کس طرح کرتی ہو، ایسی باتیں تو کوئی بڑی عمر والا، بہت پڑھا لکھا بڑا قابل آدمی کرتا ہے۔ تم تو ابھی صرف دس سالہ اسکول گرل ہو۔ چانگ سے چن!

چانگ سے چن تو خیر دس سالہ لڑکی ہے لیکن میں اس پانچ سالہ لڑکی چن چاؤ کے بارے میں کیا کہوں جس سے میں شنگھائی کی انجمن جمہوری خواتین کی ایک نرسری میں ملا تھا۔ اس پانچ سالہ لڑکی کے سامنے تو جیسے میرا اپنا سیاسی شعور بھی اس لڑکی سے بھی زیادہ چھوٹا محسوس ہوا —— ننھی چن چاؤ سے میں نے ایک سوال پوچھا تھا۔

"ڈیر لٹل چن چاؤ۔ بتاؤ تو سہی جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو کیا بنو گی؟" چن چاؤ نے اپنی توتلی زبان میں کہا
"میں بڑی ہو کر نرس بنوں گی اور کوریا کے میدان جنگ میں جاؤں گی اور سارے امریکی
حملہ آوروں کو ہلاک کر دوں گی۔"

میں آگے کچھ نہ پوچھ سکا، ایک شدید قسم کی حیرت مہر سکوت بن کر میرے ہونٹوں پر ثبت ہو گئی تھی۔

اور پھر وہ ۱۴ سالہ دیہاتی کسان لڑکا ہنگ چنگ کوی۔ جو کنٹن سے ۲۰ میل دور ایک دیہات لاؤ چانگ میں مجھے ملا۔ وہ ۱۴ سالہ لڑکا چین کی نئی زرعی اصلاح کے بارے میں جتنا کچھ جانتا ہے شاید میں بھی اتنا نہیں جانتا۔ وہ کھیت پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ دیہات کے اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے۔ لیکن وہ غدار چیانگ کائی شک ماس کی عوام دشمن جماعت کومن ٹانگ اور کسانوں کے پرانے دشمن زمیندار کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ ان تینوں کی تباہی اور چین کی آزادی سے بہت خوش ہے، اس نے مجھے بتایا کہ آج سے دو سال پہلے میں ۱۲ سال کی عمر کا تھا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تعلیم کسے کہتے ہیں ایک اچھا گھر کیا ہوتا ہے؟ میرا باپ مفلس کیوں ہے اور میری ماں ہمیشہ روتی کیوں ہے۔؟ دو سال پہلے ہم ایک ٹوٹے سے جھونپڑے میں رہتے تھے۔ اکثر اوقات ہمیں دن میں صرف ایک بار روٹی میسر آتی تھی، ہمارا کوئی کھیت نہیں تھا، لیکن میرے باپ کو اور مجھے زمیندار کے کھیت میں کام کرنا پڑتا تھا، ساری پیداوار زمیندار حاصل کر لیتا تھا، ہمیں چند سیر اناج بمشکل مہینے بھر کے لئے ملتا تھا جو شاید ہمارے لئے دس دن کے لئے بھی کافی نہیں ہوتا تھا۔ میں زمیندار کے گھر چھ سال کی عمر ہی سے نوکر کرا دیا گیا تھا، ان کے جھوٹے برتن مانجھنا اور ان کے گھر کو جھاڑو لگانا میرا کام تھا۔

یہ باتیں بتاتے وقت ہنگ چنگ کوی کے معصوم سے چہرے پر ماضی کے دکھوں کا ہلکا سا پرتو نظر آ رہا تھا۔ لیکن جب اس نے کہا۔ . . .

"اور جب ماؤزے تنگ (ماؤزے تنگ) نے چین کو آزادی دلائی ہم کسانوں کو ظالم زمینداروں کے پنجے سے آزاد کرایا تو پھر ہمارے دن پھر گئے، سب سے پہلے تو میرے باپ کو ایک کھیت مل گیا، ایک مکان ملا، اب ہمارے کھیت میں اتنی پیداوار ہوتی ہے کہ ہم بھوکے نہیں مرتے۔ اب میں پچھلے دو سال سے اپنے گاؤں کے اسکول میں تعلیم پا رہا ہوں، اب میرے پاس پہننے کے لئے ثابت اور صاف ستھرے کپڑے ہیں۔ میں بڑا ہو کر زرعی تعلیم حاصل کروں گا اور ایک پڑھا لکھا کسان بن کر اپنے کھیت اور میرے اپنے وطن کی زرعی حالت کو اور ترقی دینے کی کوشش کروں گا۔"

ہنگ چنگ کوی کا یہ جواب سن کر میں دنگ رہ گیا، یہ چودہ سالہ ہنگ چنگ کوی، وہ دس سالہ چانگ مے جن اور وہ پانچ سالہ جن چاؤ ـــ یہ چھوٹی چھوٹی عمروں والے خام عقل والے بچے ہیں یا پھر چھوٹے بچوں کے جسموں میں چھپے ہوئے بڑے بڑے دانشور ـــ؟

میں نے چین کے ہر بچے کے چہرے کو مستقبل کے چین کا نقشہ پایا ہے، میں ان کے چہروں سے ان کی ذہانت سے، ان کے شعور سے اور ان کی بات چیت سے بآسانی یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آبجو الاچین یعنی مستقبل کا چین کیسا ہوگا۔؟

میں نے چین میں بچوں کے بہت سے اسکول دیکھے ہیں، میں یہ نہیں جانتا کہ ان اسکولوں میں ان کا درسی نصاب کیا ہے بلکہ میرے مشاہدے نے مجھے بتایا ہے کہ چینی بچوں کو سب سے پہلے جو درس دیا جاتا ہے۔ وہ محبت کا درس ہے، چین سے محبت، انسانیت سے محبت، ساری دنیا کے عوام سے محبت، امن عالم سے محبت اور انسان کی معاشی اور سماجی مساوات سے محبت ـــ دوسرا درس مظلوم کی مدد ہے، چنانچہ شاید یہ اسی درس کا اثر ہے کہ پانچ سالہ معصوم جن چاؤ بڑی بے تابی سے اپنے بڑے ہونے کا انتظار کر رہی ہے کہ جیسے ہی وہ بڑی ہو کوریا جائے اور کوریا کو حملہ آوروں سے نجات دلائے۔

میں نے چین کے بچوں کو اسکولوں کی بنچوں پر بیٹھے بھی دیکھا ہے اور کھیلوں کے میدانوں میں کھیلتے اُچھلتے ناچتے بھی دیکھا ہے، میں نے انھیں اپنے محبوب قائد ماؤزے تنگ کے سامنے مارچ پاسٹ کرتے بھی دیکھا ہے اور سڑکوں پر جلوس کی شکل میں گزرتے دیکھا ہے لیکن ہر جگہ انہیں بڑا منضبط و منظم دیکھا ہے، بڑی سلیقگی اور صاف ستھرا پن ـــ وہ جب اسکولوں سے نکلتے ہیں تو دوہری قطار کی شکل میں نکلتے ہیں۔ ان کے کپڑے صاف ستھرے ہوتے ہیں ان کی صحتیں قابل رشک ہیں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چین کے ہر بچے کے جسم میں مستقبل کا ایک مضبوط، تنومند، منظم، سلیقہ مند اور دانشور چین پرورش پا رہا ہے اور پروان چڑھ رہا ہے۔ موجودہ چین بھی ایک بچہ ہے۔ موجودہ چین کی عمر صرف ۲ سال ہے، وہ تنگھائی نرسری کی بچی جن چاؤ سے عمر میں تین سال، ننھی ہانگ چاؤ کی لڑکی چانگ مے جن سے ۷ سال اور دیہات لاؤ چانگ کے کسان زادے ہنگ چنگ کوی سے ۱۲ سال چھوٹا ہے لیکن یہ دکھائی دیتا ہے جیسے ترقی کی دوڑ میں وہ جن چاؤ، چانگ مے جن اور ہنگ چنگ کوی کے ساتھ دوڑ رہا ہے ـــ یہ دو سالہ بچہ چین جب جوان ہوگا تو اس چین کی جوانی عبارت ہوگی اس ذہانت و شعور سے جو جن چاؤ ہے، دنیا بھر کے عوام کی محبت کے اس جذبے سے جو چانگ مے جن ہے اور اس ترقی یافتہ زراعت سے آج جس کا نام ہنگ چنگ کوی ہے۔

میں چین کے شفیق باپ ماؤزے تنگ کی آغوش میں دو سالہ ننھے تندرست صحت مند اور خوبصورت چین کو دیکھ آیا ہوں، میں اس کی دوسری جشن سالگرہ میں بھی شریک تھا اور اب میں اس کی پُر بہار جوانی کا انتظار کر رہا ہوں۔

زنانہ اردو خط و کتابت

شفیق الرحمٰن

شوہر کو

سرتاجِ من سلامت۔

کورنشات بجالا کر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ رسید پر یہ پڑھ کر کہ طبیعت اچھی نہیں ہے ازحد تشویش ہے۔ لکھنے کی بات تو نہیں مگر مجھے بھی تقریباً دو ماہ سے ہر رات بدخوابی ہوتی ہے، آپ کے متعلق بڑے بڑے خواب نظر آتے ہیں خدا خیر کرے۔ صبح کو صدقے کی قربانی دے دی جاتی ہے۔ اس پر کافی خرچ ہو رہا ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ میں رات کو کیا کھاتی ہوں۔ بھلا اس کا تعلق خوابوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ وہی معمولی کھانا ہوتا ہے۔ البتہ سوتے وقت ایک سیر کڑھا ہوا دودھ، کچھ خشک میوہ اور آپ کا ارسال شدہ سوہن حلوہ استعمال کرتی ہوں۔ حلوہ اگر زیادہ دیر رکھا رہا تو خراب ہو جائے گا۔

سب سے پہلے آپ کے بتائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھ دوں کہ بعد میں یاد نہ رہے، آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فرید سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلے میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل ان سے ملی تھی، شام کو تیار ہوئی تو ڈرائیور غائب تھا، یہ غفور دن بدن سست ہوتا جا رہا ہے، عمر کے ساتھ ساتھ اس کی بینائی بھی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس مرتبہ آتے وقت اس کے لئے ایک اچھی سی عینک لیتے آئیں۔ گھنٹوں کے بعد آیا تو چلنے پر اصرار کرنے لگا کہ تین دن سے کار مرمت کے لئے گئی ہوئی ہے، چاروں ٹائر بیکار ہو چکے ہیں، ٹیوب پہلے سے چھلنی ہیں یہ کار بھی جواب دیتی جا رہی ہے، آپ کے آنے پر نئی کار لیں گے، اگر آپ کو ضرورت ہو تو اس کار کو منگا لیں۔ خیر تانگہ منگایا۔ راستے میں ایک جلوس ملا، بڑا غل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے ٹریفک بند رہا۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر رحیم خاں کے صاحبزادے کی برات جا رہی ہے۔ برات نہایت شاندار تھی، تین آدمی اور دو گھوڑے زخمی ہوئے۔

راستے میں زینب بوا مل گئیں۔ یہ ہماری دور کی رشتہ دار ہوتی ہیں، احمد چچا کے سسرال والے ٹھیکیدار صاحب ہیں نا، ان کی سوتیلی ماں کی سگی بھتیجی ہیں۔ آپ ہمیشہ زینب بوا اور رحمت بوا کو ملا دیتے ہیں، رحمت بوا میری ننھیال سے ہیں، ماموں عابد کے ہم زلف کے تائے کی نواسی ہیں۔ رحمت بوا بھی ملی تھیں میں نے ان سے کہا کہ کبھی باجی قدسیہ کو ساتھ لا کر ہمارے ہاں چند مہینے رہ جائیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے۔ باجی قدسیہ بھی اپنے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تایا نعیم کے ساتھ ہماری شادی پر آئی تھیں، تایا نعیم کی ساس ان کی دادی کی منہ بولی بہن تھیں، بلکہ ایک دوسرے سے دوپٹہ بدل چکی تھیں۔ یہ سب اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ کو اپنے عزیز و اقارب یاد نہیں رہتے۔ کیا عرض کروں آجکل زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ رشتہ دار کو رشتہ دار کی خبر نہیں۔

میں نے زینب آپا کو گھر آنے کے لئے کہا، وہ اسی شام آگئیں۔ میں نے بڑی خاطر کی۔ خواہش ظاہر کرنے پر آپ کے ارسال شدہ روپیوں میں سے دو سو انھیں ادھار دیئے۔

ہاں تو میں بیگم فرید کے ہاں پہنچی، بڑے تپاک سے ملیں، بہت بدل چکی ہیں۔ جوانی میں مسز فرید کہلاتی تھیں اب تو بالکل ماں گئی ہیں ایک تو بیچاری پہلے ہی ابھرے بدن کی ہیں اس پر طرح طرح کے فکر، کمشنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتی ہیں۔ چلنے لگیں لگے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے اس سے اگلی جمعرات کو نور چشمی بتول سلمہا کی رخصت ہوگی ضرور آنا۔

میں نے حامی بھر لی۔ اور مکان کے متعلق ان سے آخری جواب مانگا۔ پہلے کی طرح چٹاخ پٹاخ باتیں نہیں کرتیں، آواز میں بھی وہ کرارا پن نہیں رہا۔ انھیں تو یہ بتول لے کر بیٹھ گئی، عمر کا بھی تقاضہ ہے۔ سوچ رہی ہوں جاؤں یا نہ جاؤں۔ دو ڈھائی سو روپے خرچ ہو جائیں گے۔ نیا جوڑا سلوانا ہوگا۔ ویسے تو ان سردیوں کیلئے سارے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں کہ بالکل نہیں آتے۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں۔ بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی اچھی لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ جسم کو تھکانا اور پھر پسینہ، نہ آج تک کی ہے نہ خدا کرائے۔ کبھی کبھی کار میں زنانہ کلب چلی جاتی ہوں، وہاں ہم سب بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں واپس آتے آتے اس قدر تھکان ہو جاتی ہے کہ بس۔

آپ ہنسا کرتے ہیں کہ نٹنگ کرتے وقت عورتیں باتیں کیوں کرتی رہتی ہیں، اس لئے کہ کسی کام میں لگی رہیں۔

آپ نے جگہ جگہ خط میں شعر و شاعری اور الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں، ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچوں والے گھر میں خط جا رہا ہے، اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ ایسی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں، شادی کو پانچ برس گذر چکے ہیں۔ خدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھئے۔ توبہ توبہ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔

اِن دنوں میں فرسٹ ایڈ سیکھنے نہیں جاتی۔ ٹریننگ کے بعد کلاس کا امتحان ہوا تھا آپ سُن کر خوش ہونگے کہ میں پاس ہوگئی۔

پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ ہوا، منے کے لڑکے کو بخار چڑھا تھا یوں تپ رہا تھا کہ چنے رکھواور بھون لو۔ میں نے تھرمامیٹر لگایا تو نارمل تھا۔ دوبارہ لگایا تو نارمل سے بھی نیچے چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ پھر گھڑی لے کر نبض گننے لگی۔ دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے لڑکے کا دل ٹھہر گیا ہو کیونکہ نبض رک گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دراصل گھڑی بند ہوگئی تھی۔ یہ فرسٹ ایڈ بھی یونہی ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے، اگر دکاندار واپس لے لے تو لوٹا دیجئے یہ باتیں بھلا ہم مشرق کے رہنے والوں کے لئے تھوڑا ہی ہیں، اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بھجوا دیجئے، ایک کتاب "گھر کا حکیم" کی بڑی تعریف سُنی ہے یہ بھی بھیج دیجئے۔

چند نئی فلمیں دیکھیں، کافی پسند آئیں، ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا لمبے لمبے بال، کھوئی کھوئی نگاہیں، کھلے گلے کا کرتہ، گانے کا شوق، کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت، آپ بہت یاد آئے۔ شادی سے پہلے میں آپ کو اسی روپ میں دیکھا کرتی تھی، کاش کہ آپ کے بھی لمبے لمبے بال ہوتے، ہر وقت کھوئی ہوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہتے، کھلے گلے کا کرتہ پہن کر گلشن میں گانے گایا کرتے نہ یہ کمبخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت لیکن خواب کب پورے ہوتے ہیں۔

ان فلموں میں ایک بات کھٹکتی ہے، ان میں عورتوں کی قوالی نہیں ہے۔ فلم بناتے وقت نہ جانے ایسی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گیت بیحد معمولی ہیں، مثلاً ایک گانا بھی ایسا نہیں ہے جس میں راجہ جی عورت سے راجہ یا مہاراجہ آتا ہو۔ یہ سادہ الفاظ گیت میں جان ڈال دیتے ہیں۔

ایک بہت ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی، زینب بوا نے شبہ سا ڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پر پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سکریٹری یا سٹینو وغیرہ آ گئی ہو اور آپ مصروفیت کی بناء پر پتہ اس سے لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل صورت میں کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہو گی؟ اس کے متعلق مفصل طور پر لکھئے، اگر ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجئے۔

باقی سب خیریت ہے، اور کیا لکھوں۔ بس بچے ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہیں، اصغر روز پوچھتا ہے کہ ابا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ نے آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اب تو ننھی کی بسم اللہ بھی قریب آ چلی ہے، ترقی ملتے تو واپس یہیں تبادلہ کرا لیجئے۔ بھاڑ میں جائے۔ ترقی اور ایسا مستقبل۔ تھوڑی سی اور ترقی دے کر تھکے دلے ہیں آپ کو اور دور نہ بھیجدیں۔

آپ بہت یاد آتے ہیں۔ ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں۔ ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ بڑا ہو پردیس کا صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امی جان کی اونی چادر اور کمبلوں کا انتظار ہے۔

ہر وقت آپ کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ رہا ہے مالی کام نہیں کرتا، اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

آتے وقت چند چیزیں ساتھ لائیں۔ بچوں کے جوتے اور گرم کوٹ۔ ننھے کی جرابیں اور کنٹوپ، ننھی کی فراک، جوتوں کے صندوق، زینب بوا کے لئے اچھا سا تحفہ، بلی کے گلے میں باندھنے کے لئے ربن اور کتے کا خوبصورت سا کالر۔ کچھ سوہن حلوہ اور ننھی کا سوئیٹر۔ ننھی کے کان میں پھنسی تھی، چچا جان سول سرجن بلانے کو کہتے تھے میں نے منع کر دیا کیونکہ کل تعویذ آ جائے گا۔

یہاں کی تازہ خبریں یہ ہیں کہ پھوپھی جان کی بھینس اللہ کو پیاری ہوئی، سب کو بڑا افسوس ہوا۔ اچھی بھلی تھی دیکھتے دیکھتے دم توڑ دیا۔ میں پرسہ دینے گئی تھی، تایا نعیم کا لڑکا کہیں بھاگ گیا ہے، احمد چچا کا جس بینک میں حساب تھا وہ بینک فیل ہو گیا ہے۔ اور ہاں پھوپھا جان کی ساس جو اکثر بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھیں اب بالکل باؤلی ہو گئی ہیں۔ بقیہ خبریں اگلے خط میں لکھوں گی۔

سرتاج کو کنیز کا آداب۔ فقط

(ایک بات بھول گئی، منی آرڈر پر مکان کا نمبر ضرور لکھا کیجئے اس طرح ڈاک جلدی مل جاتی ہے)

امّی جان کے نام

مری پیاری امّی مری جان امّی!

بعد ادائے آداب کے عرض یہ ہے کہ یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے اور خیر و عافیت آپکی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں، صورت احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت سے ہیں۔ والا نامہ آپکا صادر ہوا۔ دل کو انتہا خوشی

حاصل ہوئی۔ چچاجان کے خسر صاحب کے انتقال پُرملال کی خبر سُن کر دل کو ازحد قلق ہوا۔ جب سے یہ خبر سُنی ہے چچی جان دھاڑیں مار رہی ہیں۔ خلیفہ جی یہ بنا دُنی لے کر پہنچے تو کسی سے اتنا نہ ہوا کہ ان کی دعوت ہی کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اگر ذرا سی الکسی ہو گئی تو خاندان بھر میں تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ فوراً خادمہ کو لے کر باورچی خانہ میں پہنچی۔ اس نے جھپاک جھپاک آٹا گوندھ۔ لیکن سالن قدرے تیز آنچ پہ پک گئے چنانچہ تمیل بھلو رہی سے خلیفہ جی کی تواضع کی، بہت خوش ہوئے۔ تائی صاحبہ نے خوان بھجوا کر حاتم کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے روز ناشتہ پر بھی بلوایا۔ اوچھے کے ہوئے تیتر باہر باندھوں کہ بھیتر۔ یہ تائی صاحبہ بھی ہمیشہ اسی طرح کرتی رہتی ہیں، رنگ میں بھنگ ڈال دیتی۔

الوت بیا آئی تھیں، تائی صاحبہ کا فرمانا ہے کہ یہ بچپن سے بہری ہیں۔ بہری وہری کچھ نہیں، فقط وہ سنتی نہیں ہیں۔ کیا مجال جو آگے سے کوئی ایک لفظ بول جائے۔

دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق اُبرے دل سے ہم لوگ ممانی جان سے ملنے گئے۔ وہاں پہنچے تو سارا کنبہ کہیں گیا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے، ایک نیا جانور آیا ہے، زیبرا کہلاتا ہے بالکل گدھے کا سپورٹس ماڈل معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ دیکھ لیا ورنہ ممانی جان کی طعن آمیز گفتگو سننی پڑتی۔

پڑھائی خوب زوروں سے ہو رہی ہے، پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں مس سید آئی تھیں۔ جنہیں حال ہی میں ولایت سے کئی ڈگریاں ملی ہیں، بڑی قابل عورت ہیں۔ انھوں نے "مشرقی عورت اور پردہ" پر لیکچر دیا۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مس سید نے شنائل کا ہلکا ہلکا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ قمیض پر کلیوں کے سادہ نقش اچھے لگ رہے تھے، گلے میں گہرا سرخ پھول نہایت خوبصورتی سے ٹانکا گیا تھا۔ شیفون کے آبی دوپٹے کا کام مجھے بڑا پسند آیا، بیضوی بوٹے جوڑوں میں کاڑھے ہوئے تھے، ہر دوسری قطار کلیوں کی تھی ہر چوتھی قطار میں دو پھول کے بعد ایک کلی کم ہو جاتی تھی۔ دوپٹے کا پلو سادہ تھا لیکن بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مس سید نے بھاری سینڈل کی جگہ نقشی پہن رکھی تھی، کانوں میں ایک ایک نگ کے ہلکے پھلکے آویزے تھے ترا شیدہ بال بڑی استادی سے برم کئے ہوئے تھے۔ جب آئیں تو کوٹی کی خوشبو سے سب کچھ معطر ہو گیا، لیکن مجھے ان کی شکل پسند نہ آئی، ایک آنکھ دوسری سے کچھ چھوٹی ہے۔ مسکراتی ہیں تو دانت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ بنتی بہت ہیں۔ ویسے بھی عمر رسیدہ ہیں، ہونگی ہم لڑکیوں سے کم از کم دس سال بڑی۔ ان کا لیکچر نہایت مقبول ہوا۔

آپ یہ سُن کر پھولی نہ سمائیں گی کہ آپ کی پیاری بیٹی امور خانہ داری پر کتاب لکھ رہی ہے۔ مجھے بڑا غصہ آتا تھا جب لوگوں کو یہ کہتے سنتی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کا کام کاج نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ میں نے یہ آزمودہ ترکیبیں لکھی ہیں جو ملک کے مشہور زنانہ رسالوں میں چھپیں گی۔ نمونے کے طور پر چند ترکیبیں نقل کرتی ہوں

لذیذ آرنج سکواش تیار کرنا

آرنج سکواش کی بوتل لو، یہ دیکھ لو کہ بوتل آرنج سکواش ہی کی ہے کسی اور چیز کی تو نہیں۔ ورنہ نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہوں گے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مہمانوں اور گلاسوں کی تعداد ایک ہونی چاہئے۔ گلاسوں کو پہلے صابن سے دھلوا لینا اشد ضروری ہے۔ بعد ازیں سکواش کو بڑی حفاظت سے گلاس میں انڈیلو اور پانی کی موزوں مقدار کا اضافہ کرو، مرکب کو چمچے سے تقریباً نصف منٹ ہلاؤ۔ نہایت روح افزا آرنج سکواش تیار ہوگا۔

موسم کے مطابق برف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (لیکن برف کو صابن سے دھلوالینا نہایت ضروری ہے)

انڈا اُبالنا

یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں، لیکن اگر مشق ہو جائے تو ذرا مشکل نہیں لگتا۔ ایک انڈا لو (بہتر ہوگا کہ انڈا مرغی کا ہو) پیشتر اس کے کہ عمل شروع کیا جائے یہ معلوم کر لینا بہت اہم ہے کہ انڈا خراب تو نہیں۔ اس کا سہل اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو ایک کونے سے ذرا سا توڑ کر تسلی کر لی جائے۔ اب انڈے کو پانی میں ڈبو کر پانی اور انڈا دیگچی میں ڈالو۔ دیگچی کو چولہے پر رکھ کر گرم کرو اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد پانی میں انگلی ڈال کر دیکھتی رہو کہ اُبال آنا شروع ہوا ہے یا نہیں۔ سُوں سُوں کی آواز پر آگ بجھا دو۔ اور ہاتھ یا کسی اور چیز کی مدد سے جلدی سے انڈا دیگچی سے باہر نکال کر ٹھنڈا کر لو۔ اب انڈا تیار ہے اور کھایا جا سکتا ہے۔

مزیدار فروٹ سلاد تیار کرنا

مہمانوں کے یکلخت آ جانے پر ایک ملازم کو جلدی سے بازار بھیج کر کچھ بالائی اور ایک ٹین پھلوں کا منگاؤ۔ اس کے آنے سے قبل ایک بڑی قاب کو صابن سے دُھلوا لینا چاہیئے ورنہ بعض اوقات فروٹ سلاد میں اور صابن کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ اب ٹین کھولنے کا اوزار لے کر ٹین کا ڈھکنا کھولنا شروع کرو، اور خیال رکھو کہ کہیں انگلی نہ کٹنے پائے۔ بہتر ہوگا کہ ٹین اور اوزار نوکر کو دیدو۔ اب پھلوں کو ڈبے سے نکال کر حفاظت سے قاب میں ڈالو اور بالائی کی ہلکی ہلکی تہہ جماؤ۔ نہایت مزیدار اور مفرح فروٹ سلاد تیار ہے، نوش جان کیجیے۔

میز پوش سینا

جس میز کے لئے پوش درکار ہو اُس کا ناپ لو، بہتر ہوگا کہ کپڑے کو میز پر پھیلا کر لمبائی کے مطابق وہیں قینچی سے قطع کر لیا جائے اب ہاتھ یا پاؤں سے چلانے والی سینے کی مشین منگاؤ، سوئی میں دھاگہ پرو کر میز پوش کے ایک کونے سے سلائی شروع کرو۔ اور سیتی چلی جاؤ حتیٰ کہ وہی کونا آ جائے جہاں سے بخیہ شروع کیا تھا۔ اب میز پوش کو استعمال کے لئے تیار سمجھو، اگر سیتے وقت سارے کپڑے کے دو چکر لگ جائیں تو دگنا پائیدار میز پوش تیار ہوگا۔ ضرورت کے مطابق بعد میں بیل بوٹے کاڑھے جا سکتے ہیں۔

استری پھیرنا

اپنے قد سے تقریباً دو فٹ نیچی میز منگاؤ، استری میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالو اور ہاتھ پھیر کر دیکھتی رہو کہ گرم ہو گئی ہے یا نہیں۔ جب ہاتھ پھیرنا مشکل ہو جائے تو سمجھ لو کہ استری تیار ہے اور پھیری جا سکتی ہے۔ اب استری کو کپڑے پر پھیرو۔ کپڑے کی تہہ درست کرنا نہ بھولنا چاہیئے۔ ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے دیتی جاؤ (کپڑے پر) جب کپڑا بھورا ہونا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ مکمل استری ہو گئی۔ دوسرا کپڑا پہلے استری شدہ کپڑے پر پھیلا کر یہ عمل دُہرایا جا سکتا ہے۔ جب ایک جانی پہچانی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگے تو استری یکلخت بند کر دو۔

کپڑے ڈرائی کلین کرنا

مناسب کپڑے چن کر ایک سمجھدار ملازم کے ہاتھ ڈرائی کلین کی دکان پر بھجوا دو۔ بھیجنے سے پہلے ایک فہرست ضرور تیار کر لو۔ بہتر ہوگا کہ صرف وہی کپڑے بھیجو جنہیں بعد میں پہچان سکو۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کپڑے واقعی ڈرائی کلین

کئے گئے ہیں۔ ایک بڑی آزمودہ ترکیب ہے کپڑوں کو سونگھ کر دیکھو۔ اگر پٹرول کی بو آ رہی ہو تو سمجھ لو ٹھیک ہے اب کپڑے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں اور انہیں فوراً استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

سچ بتانا امی امی جان آپ کو یہ ترکیبیں پسند آئیں؟ ایسے اور بہت سے نسخے بھی میرے پاس محفوظ ہیں جنہیں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

میں علی الصبح اٹھتی ہوں، آپکا ارسال شدہ ٹائم پیس اتنے زوروں سے بجتا ہے کہ رات کو اسے رضائی میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھنا پڑتا ہے۔ عید پر جو خالہ جان نے موٹاپے کا طعنہ دیا تھا اس کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہوں، فالتو چیزوں کا استعمال آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں، نشاستے سے پرہیز کرتی ہوں کپڑوں تک میں نشاستہ نہیں لگنے دیتی۔

ایک خوشخبری دینا تو بھول ہی گئی، آپ کی پیاری بیٹی اس سال فارسی میں کالج میں دوئم آئی ہے یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ لونڈی کس لائق ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں کلاس میں دیر سے پہنچی تھی، پہلا گھنٹہ فارسی کا ہوتا تھا اور فارسی میں صرف دو لڑکیاں تھیں نجمہ اور میں۔ شاید یہ اطلاع میری سہیلیوں میں سے نہیں بلکہ رشتہ داروں میں سے کسی نے پہنچائی ہوگی۔

اب خط ختم کرتی ہوں، میری طرف سے بزرگوں کی خدمت میں آداب۔ بچوں کو بہت بہت پیار۔ اور سب کو ماواجب۔

دیکھئے وہ کونسا مبارک دن ہوتا ہے کہ میں اپنی امی کو جھک کر آداب کروں اور امی جان مجھے کلیجے سے لگالیں اور سدا لگائے رکھیں۔ آمین ثم آمین! فقط

ناچیز آپ کی بیٹی۔

منگیتر کو

جناب بھائی صاحب،

آپکا خط ملا، میں آپ کو ہرگز خط نہ لکھتی لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کی بہن میری سہیلی ہیں اور کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔ وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کبھی ایک غیر مرد کو خط بھیجوں گی۔

امید کرتی ہوں کہ آئندہ خط لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ایک شریف گھرانے کی ایشیائی لڑکی سے مخاطب ہیں ــــ احتیاطاً تحریر ہے۔ میرا آپ کو خط لکھنا اس امر کا شاہد ہے کہ ہم لوگ کس قدر وسیع خیالات کے ہیں۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ رشیدہ اور حمیدہ کو جانتے ہیں کلثوم اور رفعت سے بھی واقفیت رہ چکی ہے ثریا اور اختر کو خط لکھا کرتے تھے۔ آپ کو کلب میں ناچتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے اور ایک شام کو آپ چمکیلی سی پیلے رنگ کی چیز چھوٹے سے گلاس میں پی رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ماڈرن نہیں ہیں، ہمیں یہ ہوا نہیں لگی، نہ اس روش پر چلنے کا ارادہ ہے، ہمارے ہاں جہاں مذہب، شرافت اور خاندانی روایات کا خیال ملحوظ ہے وہاں اعلیٰ تربیت اور بلند خیالی بھی ہے۔

میں بی اے (آنرز) میں پڑھتی ہوں۔ شام کو مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے مجھے تانگے میں کالج سے نکلتے دیکھا تھا اور میں نے برقعے کا نقاب الٹ رکھا تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔ اول تو میں ہمیشہ کار میں کالج جاتی ہوں دوسرے یہ کہ میں نقاب نہیں الٹا کرتی ہمیشہ برقعہ میرے ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

جی ہاں مجھے ٹھوس مطالعہ کا شوق ہے۔ ابا جان کی لائبریری میں فرائیڈ، مارکس، ڈکنز، آگاتا کرسٹی، کارلائل، پیٹر چینی، تھورن سمتھ اور دیگر مشہور مفکروں کی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے سائیکلوجی پڑھنی شروع کی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ فلاسفی پڑھی تو محسوس ہوا جیسے یہ سب درست ہے۔ سوشل سائنس پڑھی تو لگا کہ واقعی یوں ہی ہونا چاہیے تھا، آخر ہمیں ایک نہ ایک روز تو جدید تہذیب کے دائرے میں آنا تھا۔ زمانے کو بیسویں صدی تک کبھی تو پہنچنا ہی تھا میرے خیال میں میں کافی مطالعہ کر چکی ہوں۔ چنانچہ آج کل زیادہ نہیں پڑھتی۔

آپ نے پوچھا ہے کہ موجودہ ادیبوں میں مجھے کون کون پسند ہیں۔ سو ڈپٹی نذیر احمد، مولانا راشد الخیری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میرے محبوب مصنفین ہیں، شاعروں میں نظیر اکبر آبادی مرغوب ہیں۔ خواتین میں ایک صاحبہ جن کا نام انگریزی کے حروف سے شروع ہوتا ہے بہت پسند ہیں، انھوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں، ان میں جدید اور قدیم زیورات و پارچہ جات، بیاہ شادی کی ساری رسوم اور طرح طرح کے کھانوں کے ذکر کو اس خوبصورتی سے سمو دیا ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ناول کہاں ہے اور یہ چیزیں کہاں؟

ایک اور خاتون ہیں جو باوجود ماڈرن ہونے کے ترقی پسند نہیں ہیں۔ ان کے افسانے ان کی امنگیں ان کی دنیا سب کچھ صرف اپنے گھر کی فضا اور اپنے خاوند تک محدود ہے مبارک ہیں ایسی ہستیاں۔ ان صاحبہ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا پھر پتہ چلا کہ ان کا رنگ مشکی ہے اور عینک لگاتی ہیں۔

آپ کی جن کزن کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے کلب میں دیکھا تھا ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ خود وہاں کیا کر رہی تھیں۔

یہ جن حمید صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی تو نہیں جو گورے سے ہیں جن کے بال گھنگھریالے ہیں اور داہنے ابرو پر چھوٹا سا تل ہے گاتے اچھا ہیں۔ رد لکھتے بہت جلدی ہیں۔ جی نہیں، میں انھیں نہیں جانتی۔ شاید میں ان سے کبھی نہیں ملی۔

میری حقیر رائے میں تو آپ نے آرٹس پڑھ کر بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ آپ کی بہن نے لکھا ہے کہ اب آپ کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اگر یہی ارادہ تھا تو اتنے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر میں گنجائش ہو تو ضرور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جائیے۔ ملازمت کی کوشش کیجیے۔ کیونکہ ملازمت ہر صورت میں بہتر ہے، اس کے بغیر پوزیشن ہے نہ مستقبل۔ یہاں ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیوی ساری زنانہ انجمنوں کی سکریٹری ہیں اور تقریباً ہر زنانے جلسے کی صدارت وہی کرتی ہیں۔ دوسرا فائدہ ملازمت کا یہ ہے کہ انگلستان یا امریکہ جانے کے بڑے موقعے ملتے ہیں۔ مجھے یہ دونوں ملک دیکھنے کا از حد شوق ہے۔

آپ نے موسیقی کا ذکر کیا ہے۔ اور مختلف راگ راگنیوں کے متعلق میری رائے پوچھی ہے۔ جی ہاں مجھے بھی تھوڑا بہت شوق ہے۔ جے جے ونتی سے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں ـــ آپ کو تعجب ہوگا کہ جب دلی سے بھٹنڈہ آتے وقت میں نے جے جے ونتی سٹیشن کو دیکھا تو مجھے بھی پسند نہیں آیا۔ میاں کی ملہار سے آپکی

مراد غالباً خاوند کی طرف سے ہے۔ جی نہیں میں نے یہ نہیں سنی ویسے ایک خاندان کے افراد بھی میاں کہلاتے ہیں شاید ملہاران کی ہو۔ آپ کا فرمانا ہے کہ لوڈی بسنت کی چیز ہے لیکن میں نے لوگوں کو صبح و شام ہر وقت لوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سنا ہے۔

بھوپالی کے متعلق میں زیادہ عرض نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے بھوپال جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ جوگ اور بھاگ کے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ جب یہ ملتے ہیں تو سوزِ عشق جاگ اٹھتا ہے (ملاحظہ ہو "جاگ سوزِ عشق جاگ")

جی ہاں مجھے فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی ہے، مصوری، بت تراشی، موسیقی، فوٹوگرافی اور کروشیے کی بہت سی کتابیں اباجان کی لائبریری میں رکھی ہیں۔ میں اچھی فلمیں کبھی نہیں چھوڑتی، ریڈیو پر بہت اچھا موسیقی کا پروگرام ہو تو ضرور سنتی ہوں۔ خصوصاً دوپہر کے کھانے پر۔ سیاسیات پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کے متعلق اپنی رائے اگلے خط میں لکھوں گی۔

آپ کو میری سہیلی کے بھائی نے میرے متعلق باتیں بتائی ہیں، ہاں یہ درست ہے کہ اسحٰق بھائی ہمارے ہاں آتے ہیں لیکن بس پندرہ بیس منٹ سے زیادہ دیر کیلئے نہیں۔ اشفاق بھائی اور انور بھائی ہمارے ساتھ پہاڑ پر ضرور گئے تھے۔ لیکن ان کی کوٹھی ہم سے ایک میل دور تھی، پہاڑ کے دوسری طرف۔ لطیف بھائی اور کلیم بھائی فقط اپنی بہنوں کو چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ میں نے عفت کے بھائی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ رحیم بھائی یونہی سٹیشن پر مل گئے تھے، میں چھٹیوں پر گھر آ رہی تھی، انھیں کوئی کام تھا۔ وہ اپنے ڈبے میں بیٹھے رہے میں اپنے ڈبے میں۔ آپ جمیل بھائی اور مسعود بھائی سے پوچھ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن مجھ سے خفا ہیں اور خط نہیں لکھتیں۔ ذرا ان سے کہئے کہ شکایت تو الٹی مجھے ان سے ہونی چاہئیے۔ انھوں نے رقیہ کو وہ بات بتا دی جو میں نے انھیں بتائی تھی کہ رقیہ کو نہ بتانا۔ خیر بتانے میں تو اتنا حرج نہ تھا لیکن میں نے ان سے تاکیداً کہا تھا کہ اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ اُس سے نہ کہنا۔

ان سے یہ بھی پوچھئے کہ یہ کزن والی کون سی بات ہے جس پر انھوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ رقیہ تک نہ پہنچے۔ مجھے تو یاد نہیں۔ ویسے میری عادت نہیں کہ دانستہ طور پر کوئی بات کسی کو بتاؤں۔ اگر کبھی بے دھیانی میں منہ سے نکل جائے تو اور بات ہے۔

خط گھر کی بجائے کالج کے پتے پر بھیجا کیجئے اور اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی زنانہ نام لکھا کیجئے، یوں معلوم ہو جیسے کوئی سہیلی مجھے خط لکھ رہی ہے۔

باقی سب خیریت ہے

فقط آپ کی بہن کی سہیلی

(اور اس خط کا کسی سے بھی ذکر مت کیجئے، تاکیداً عرض ہے)

سہیلی کو

پیاری سہیلی بہنیلی۔

اُوئی دل پتھر کر لیا ہے، ایسا بھی کیا، کبھی خیر سلا کے دو لفظ ہی بھیج دیا کرو، وہی معاملہ ہوا، کہ آنکھیں

ہوئیں اوٹ تو دل میں آیا گھونٹ۔

شاید تمہیں پتہ نہیں کہ میں پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ بُرا میرا تو وہاں بالکل دل نہیں لگا، لوگ قدرتی نظارے قدرتی نظارے کی رٹ لگاتے ہیں میرا تو ہفتے میں جی اچاٹ ہو گیا۔ نہ کوئی ڈھنگ کا سینما ہال، نہ اللہ ماری کوئی کام کی کپڑوں کی یا زیوروں کی دکان۔ دو مہینے میں صرف آٹھ جوڑے سلوا سکی۔ اور صرف ایک جوڑی سونے کے آویزے پسند آئے۔ اس آنے جانے میں نگوڑا اپنا گرم کوٹ بھی نہ سِل سکا۔ اب سردیوں میں وہی پچھلے سال بنوایا ہوا کوٹ پہننا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری گرمیوں میں ایک بھی نئے ڈیزائن کا جوڑا نہیں سلوا سکی۔ کسی نئی فلم میں ہیروئن کے کپڑے دیکھوں تو کچھ بنواؤں بھی۔

ایک بات بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گی، کیونکہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں، وہ جو رشید ہے نا۔ اب تم مجھے چھیڑو گی، اے ہٹو۔ پہلے سُن بھی لو، اس کے چچا کالج میں پروفیسر بن کر آئے ہیں، ہوں گے کوئی پینتالیس چھیالیس برس کے، میں اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہوں، چنانچہ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی۔ حالانکہ میں نے اتی سی بھی لفٹ نہیں دی، سوائے اس کے کہ میں غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا کرتی تھی (آنکھیں اچھی ہیں) پروفیسروں کو کون غور سے نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھار ان سے علیحدگی میں سوال پوچھ لئے تو کیا ہوا۔ کل تین یا چار مرتبہ ان کے ساتھ چائے پی، وہ بھی ان کے بلانے پر، عید پر انھوں نے چھوٹے موٹے تحفے دئیے جو ان کا دل رکھنے کیلئے قبول کرنے پڑے۔ صرف ایک دو دفعہ ان کے ساتھ پکچر دیکھی۔ بس کیا تھا شاعری پر اتر آئے، کہنے لگے تم اب تک کہاں تھیں، میری زندگی میں پہلے کیوں نہ آئیں۔ حالانکہ ان کی زندگی کے شروع کے حصے میں تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شکل صورت معمولی ہے، گنجے بھی ہیں۔ سُنا ہے کئیوں سے وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔ پانچ چھ سال کے بعد بڑے بوڑھوں میں کہلائیں گے۔ تعجب ہے اس عمر میں بھلا کوئی کیا وعدہ کر سکتا ہے۔

ناہید نے تو سب کے سامنے ان کی خبر لی، انھیں جھوٹا، ہٹ دھرم، مکّار اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بعد میں معلوم ہوا کہ خیر سے ہاکی فٹ بال کے ریفری بھی ہیں اور اس قسم کے کلمات کے عادی ہو چکے ہیں دراصل ناہید بندی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کھٹ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا، بالکل بلا سوچے سمجھے، جیسے کہ بعض لڑکیاں اکثر کرتی ہیں۔

ایک شام کو ان کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ سینما گئی، وہاں رشید اگلے درجے میں بیٹھا تھا۔ نہ جانے چچا کو کیا سوجھا کہ بھتیجے کو بلا کر پاس بٹھا لیا اور مجھ سے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ رشید کو خواہ مخواہ آگ لگ گئی۔ رشید کے چچا کی اس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا، انھوں نے نہ صرف میرا مستقبل کا پروگرام تباہ کر دیا بلکہ ایسی اچھی شام برباد کر کے رکھ دی۔ آج کل رشید کی مجھ سے لڑائی ہے، کل میں نے فون کیا تو طعنے دینے لگا، بولا تم بے حد خطرناک ہو۔ عجب الٹی منطق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی عورت بھی خطرناک نہیں ہوتی یہ مرد ہی ہے جو کمزور ہوتا ہے۔ دونوں جائیں بھاڑ میں، سُنا ہے رشید زیبو کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کا چچا سلی کے پیچھے۔

زیبو تو تمہاری ہم جماعت تھی۔ بیچاری بڑی بنتی ہے۔ میں تو اُسے تب سے جانتی ہوں جب سے اس کے متعلق کوئی چھوٹی سی افواہ تک نہیں اڑی تھی۔ پتہ نہیں کس بات پر اتراتی ہے۔ اُجڑا اُجڑا حلیہ، دبلی پتلی اتنی کہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے دو بار دیکھنا پڑتا ہے۔ پچھلے سال کسی سیکنڈ لفٹننٹ سے واقفیت

تھی۔ اس سال بھی سنا ہے کسی اور سکینڈ لفٹننٹ کے ساتھ سکینڈل رہا۔ بار بار اسے سکینڈ لفٹننٹ ہی ملتا ہے، پہلا لفٹننٹ بھاگ جاتا ہوگا۔ کیا بتاؤں ان دنوں اتنی بدل چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ پچھلے ہفتے ایک پارٹی پر ملاقات ہوئی۔ میں نے نئے بندے اور نیا نکلس پہن رکھا تھا۔ جھوٹے منہ سے ان کے بارے میں ایک لفظ نہ نکلا، حالانکہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، ادھر میں نے کئی مرتبہ جھوٹ موٹ اس کی چیزوں کی تعریف کی۔ بے میچ کی ہوئی جڑاؤ بیلٹ کو بار بار سجاتی تھی۔ ایسی اکل کھری نندیدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سنا ہے رشید اسے خوابوں کی ملکہ کہتا ہے، ضرور خوابوں میں ڈرتا ہوگا۔

ستی غریب بائیس برس کی ہو چکی ہے اور اب تک کوئی نہیں ملا۔ میں نے تو کئی مرتبہ کہا گزٹ پڑھا کرو۔ آجکل ترقی ملنے پر ادھیڑ عمر کے لوگ اکثر نئی شادی کر بیٹھتے ہیں، ایسے کئی مل جائیں گے۔

سنا ہے اس کے لئے ایک رشتہ بھی آیا تھا، کسی بڑے زمیندار کا جس کے پاس ۵۰ درجن گائیں بھینسیں تھیں اور جو دھسکی میں دودھ ملا کر پیا کرتا تھا۔ پھر جہیز کے معاملہ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔

ان صاحبزادی کو بھی پر لگ رہے ہیں، کیا تو جیسے زبان تھی ہی نہیں کیا اب کترکتر چلتی ہے۔ فرماتی ہیں میں تو سرخی اس لئے لگاتی ہوں کہ اور لڑکیوں میں نمایاں معلوم نہ ہوں۔ ایک اور فقرہ ملاحظہ ہو، کہتی ہیں ـــــ مُوا دل کیا ہے برف کا تودا ہے، اتنی جلدی پگھل جاتا ہے۔ یہ سب رشید کے چچا کا اثر ہے مجھے ان پروفیسر صاحب پر غصہ ہے تو اس بات کا کہ ساری خرافات مجھ ہی کو سناتے ہیں، اباجان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ جیسے کہ خاندانی لوگوں میں دستور ہے۔ گنجے ہیں تو کیا ہوا۔ مرد اکثر گنجے ہو جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر آنکھوں کی طرف دیکھتے رہو تو صرف چالیس برس کے لگتے ہیں۔ خیر دفع کرو ان سب کو۔ نبّو کی منگنی ہونے والی ہے، میں نے چھیڑا کہ نبّو کا منگیتر پبلشر ہے اس لئے انگوٹھی پر جملہ حقوق محفوظ ہیں ضرور لکھوائیں۔

عفّو کی بات پکی ہو گئی ہے، انہیں اس نے منگیتر کو نہیں دیکھا۔ لیکن سنو گی تو خوش ہو گی کہ چھ سو روپیہ ماہوار پاتا ہے، اکلوتا ہے، بہن بھائی کے قضیئے سے پاک ہے۔ عفّو کے والدین نے اچھی طرح یقین کرا لیا ہے کہ شراب نہیں پیتا اور کیا چاہیئے؟ اور ہاں لڑکے کی والدہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ عفّو نے تو یہاں تک سنا ہے کہ انکا ارادہ حج کے بعد وہیں رہ جانے کا ہے، خدا کرے یہ خبر صحیح ہو۔

اچھا بہن تم اپنی سناؤ، کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔ تمہاری خاموشی سے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے ـــ؟ ۔ دور ہوں تو کیا، تل تل رتی رتی سب جانتی ہوں۔ اللہ وہ دن لائے کہ اپنی پیاری سہیلی کے ہاتھ رنگے ہوئے دیکھوں۔ خدا سہیلی دے تو ایسی جسکی دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔

منّو تو تمہیں یاد ہوگی۔ اس کی شادی پر ہم سب گئے تھے، سنا ہے لڑکے نے اعتراض کیا کہ نہ تو رسم ادا کی جائیں اور نہ باجا گاجا ہو، خاموشی سے سب کچھ ہو جائے۔ توبہ کیسا ہونق لڑکا ہوگا۔ شادی ہو رہی ہے یا کوئی چوری کر رہے ہیں۔ ولایت سے ابھی ابھی آیا ہے اس لئے دماغ درست نہیں ہوا۔ لیکن کون سنتا ہے رسمیں ساری ہوئیں، مانجھے بٹھانا، کنگنا باندھنا، مہندی لگانا، مسالا پسوانا، پانی بھروانا، ساچق کا بھیجنا، تمہیں خوشی ہوگی کہ مہر تیس ہزار مقرر ہوا ہے اور ڈیڑھ سو روپے جیب خرچ لکھا گیا ہے، منّو کتنی خوش نصیب ہے باقی کی رسمیں بھی ادا کی گئیں، چوتھی کھیلنا، دلہن کی جوتی دولہا کے کندھے پر لگانا، آرسی مصحف کرنا، دولہا کے

رہمہنوں کا آنچل ڈالنا۔ دولہا کو زعفران کے بہانے مرچیں کھلا دینا، دولہا کے جوتے چرا لینا۔ پھر دولہا کو الٹی چارپائی پر گرا دینا۔ اس کی شیروانی پلنگ سے سی دینا، میراسنوں کا بیہودہ گانے گانا اور خوب صورت گالیاں دینا۔ بڑا مزا رہا۔ دولہا بھی ایک چغد نکلا۔ جنم نہ دیکھا بچھیا سپنے آئی کھاٹ، سنا ہے کہ نکاح کے فوراً ہی بعد کہیں فرار ہو گیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ کر لائے۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکے کیسے ہو گئے ہیں۔ یہی رسومات تو قوموں کے زندہ رہنے کے نشان ہیں۔ دولہا نے مہر میں بھی مین میخ نکالی کہ بیس ہزار کا جو جہیز لڑکی کو دے رہے ہیں یہ اپنے پاس رکھئے اور تیس ہزار کی رقم کو کم کر کے مہر دس ہزار کر دیجئے۔ لاحول ولا قوۃ!

شادی میں کچھ لڑکے بھی تھے۔ ہمیں چھیڑنے لگے۔ ڈانٹا تو بولے سنگار کیوں کرتی ہو۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہم کپڑے اور زیور صرف ایک دوسری کو دکھانے کے لئے پہنتی ہیں، موئے لڑکوں کو اس سے کیا۔

منو کی رخصت ہو گئی، خدا کرے کہ بنتی رہے۔ ہمیشہ بنی رہے لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ افواہ ہے کہ اس کی ساس نندیں بڑی ظالم ہیں، پر کا کوا اور رائی کا پہاڑ بنانے کو ہر دم تیار ہیں۔ پر بہن یہ مرحلہ تو ہر لڑکی کو طے کرنا ہے۔

رشید کے چچا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق ایک لطیفہ سنا کہ رنڈوے ہیں۔ مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ بیوی زندہ ہیں۔ خیر مجھے اس سے کیا۔

اوئی کتنا لمبا خط لکھا ہے۔ لو اب خوش ہو یا اب بھی روٹھی رہو گی۔ اب خط لکھو، مفصل سا ہو۔ کس کس کی محبت ٹوٹی ہے۔ کس کس کے گھر سٹکر رنجی ہوئی ہے یا ہونے کا امکان ہے۔ ہماری جاننے والیوں میں سے کوئی سسرال سے لڑ کر آئی ہو۔ میرے متعلق کسی سے کوئی بات تو نہیں سنی۔ ان دنوں کس کس کے سکینڈل چل رہے ہیں۔ کوئی نیا فلمی گانا پسند آیا یا غزل سے یا جمپر کا کوئی نیا ڈیزائن — ساری باتیں مفصل لکھنا۔

امید ہے کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکی ہو گی۔ کبھی آ کر مل ہی جاؤ۔ صرف چالیس پچاس میل کا تو فاصلہ ہے۔ فقط

تمہاری دور افتادہ سہیلی

●

انٹلکچوئل

بسم اللہ دیباچۂ فسانۂ نغمہ زنی عندلیب خانہ، رنگین ترانۂ راست براست، بلاکم و کاست بوقلمون کونۂ حجاز یاد سندھی عفی عنہ۔

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے۔ ملت مدید عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک جوان نحیف و زار (کہ جس کو نوجوان کہنا خوش فہمی میں شامل تھا) کافی ہاؤس کے دروازہ پر زندگی سے بیزار کھڑا تھا۔ نام اس نوجوان دراز قد کا حجاز یاد تھا، تخلص سندھی اور لقب خورد تھا۔ بہن اسب کچھ ملا کر اپنے تئیں حجاز یاد سندھی خورد کہلاتا تھا اور پھولا نہ سماتا۔ حلیہ اس جوان کا فاقہ زدہ تھا اور سر کے بال مانند — خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک زندگی کے دن توڑ رہی تھی۔ شیو اس نے ہفتہ بھر سے نہیں کرایا تھا۔ بغل میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پوشاک نے جو اسے پہنے ہوئے تھی ظاہر ہے کہ یہ نوجوان انٹلکچوئل طبقے سے متعلق تھا۔

شفیق الرحمٰن

بنتِ قمر

ق الخیری

اب کے موسمِ بہار کس تابانی سے آیا ہے! ہر جگہ سبزہ، ہر طرف پھول، ہر سمت تازگی، گویا کائنات کو حیاتِ نو ملی ہے۔ لیکن یہ ہریالی اور یہ شادابی جاوداں نہیں۔ ایک دن اسے نذرِ خزاں ہونا ہے۔ زندگی کی بہار بھی عارضی ہے، ہماری خوشیاں بھی زوال آمادہ ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ گلشنِ حیات میں دائمی بہار کیوں نہیں آتی؟ ایسی بہار جو خزاں کو جنم نہ دے، جس کے بطن سے افسردگی پیدا نہ ہو۔

میرا دل چاہتا ہے کہ والد کی طرح جنھیں میں بچپن سے ڈیڈی کہتی ہوں اپنے اہم واقعات باقاعدہ تحریر کیا کروں۔ وہ کہتے ہیں اس سے جی بہلتا ہے اور جو بات زبان پر بیرطا نہیں آسکتی، وہ نوکِ قلم پر پوشیدہ طور پر آکر دل کی پھانس نکال دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی ڈائری کسی کو نہیں دکھاتے، مجھ تک کو نہیں، بلکہ ایک دفعہ میں نے ضد کی تو وہ کچھ خاموش سے ہو گئے، اور اس کے بعد پھر کبھی مجھے اصرار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں ڈائری صرف اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے، یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے کسی غیر کو پڑھنے کا حق نہیں، ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے کی ڈائری پڑھنا لکھنے والے پر ظلم ہے، یہ تو دل کی کتاب ہے اور دل کا حال سوائے خدا کے کسی اور کو جاننا زیب نہیں دیتا ــــ آج میں نے ڈائری لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس میں لکھا کروں گی۔ اُسے کوئی دوسرا نہیں پڑھے گا۔

۳۱ مارچ۔

یہ ڈائری نہ جانے کب شروع ہوتی، لیکن شام کو ایک عجیب بات ہو گئی، یونیورسٹی کی طالبات لان کے ایک کونے میں جمع تھیں۔ گفتگو کا موضوع بار بار بدل رہا تھا، اور بات میں بات نکلتی تھی، ہم سب ہنس بول رہے تھے، چہلیں ہو رہی تھیں، کبھی سلمیٰ، کبھی عابدہ اور کبھی احمدی کو نقلِ محفل بنایا جا رہا تھا کہ ناموں کا ذکر چل نکلا عابدہ ایک دفعہ ہی مجھ پر پل گئی، کہنے لگی "چلو میرا نام تو ماں باپ نے غلط رکھا، مگر تم بتاؤ، یہ بنتِ قمر کیا ہوا؟ قدسیہ نے میری طرف سے جواب دیا۔" ان کا نام تو بالکل ٹھیک ہے شکل چودھویں رات کے چاند سی پائی ہے، جسم بلّور، ذرا پیچھے ہٹ کے دیکھو، ماہ پارا ہے یا نہیں؟ یہ قد موزوں، یہ سنہرے بال، یہ میدہ شہاب رنگ، یہ ماہتاب سا چہرہ۔۔۔۔ مگر میں چپ ہو گئی، دماغ میں بے شمار افکار بیک وقت تیزی سے گردش کرنے لگے، میں ایک بات اچھی طرح نہیں سوچ پاتی کہ دوسری سطحِ ذہن پر ابھر آتی تھی۔۔۔۔ میں اُن سے نہ کہہ سکی کہ ہاں میرا نام بنتِ قمر ہے، میں قمر الزماں کی بیٹی ہوں، ڈیڈی نے یہ نام اس لئے تجویز کیا کہ وہ مجھے صرف اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں، وہ مجھے سر تا پا اپنا ہی عکس تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جانا چاہتے ہیں کہ میری رگوں میں ایک ایسی عورت کا بھی خون

دیتا ہے جس نے دوسرے مرد کی خاطر اُن سے بے وفائی کی، یہ عورت میری فرنگی ماں تھی جس نے میرے بڑے چچا کو اپنی زندگی کا ساتھی چنا اور میری ماں ہوتے ہوئے بھی بڑے ابا کی ہو گئی۔ ڈیڈی نے اس سانحہ کو بہادر انسان کی طرح انگیز کیا اور اس کے بعد ان کی تمام توجہات، ساری شفقتیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا، یہی دیکھا کہ وہ زیادہ تر وقت میری تربیت اور نگرانی پر صرف کرتے ہیں، میرا بچپن اور لڑکپن، اُن ہی کی آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ وہی میرے باپ اور وہی میری ماں ہیں۔ وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے میرا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہے — لیکن یہ گھر کے لوگ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ ممی نے کیوں بے وفائی کی؟

کیوں انھوں نے ڈیڈی جیسے نیک دل اور اپنی کھیلتی مالتی بچی کو چھوڑ کر دوسرے آدمی کا گھر بسایا؟

جب وہ ڈیڈی سے علیحدہ ہوئیں تو میں بہت چھوٹی تھی، جدائی کے وقت کیا ہوا ہوگا، یہ مجھے خبر نہیں بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں سن شعور کو پہنچ گئی تھی، شاید اس لئے کہ میں الگ رہنے کی عادی تھی مجھے انکی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہوا، لیکن ڈیڈی رنج سے نڈھال ہو گئے۔ مجھے یاد ہے جس روز ان کے مرنے کی خبر آئی۔ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے بہت دیر تک یونہی دیکھا کئے حتیٰ کہ مجھے رونا آگیا، میں اٹھ کر ان کے پاس چلی گئی اور انھوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

ہمارا بھرا پُرا گھر ہے۔ کنبہ وسیع اور آسودہ حال ہے جب تک ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع نہیں کیا، میں رشتے داروں سے اکثر ممی کے متعلق پوچھتی تھی، مگر صرف اتنا معلوم ہوا کہ ڈیڈی کی یہ شادی بھی غلط انتخاب کا نتیجہ تھی، پہلی شادی اس لئے ناکام رہی کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف والدین نے کی تھی، ڈیڈی کو پہلی بیوی ایک آنکھ نہ بھائی اور انھوں نے ولایت سے آکر اُسے طلاق دیدی، ولایت میں انھوں نے ممی سے شادی کی اور وہ چند سال بعد انھیں چھوڑ کر بڑے ابا کے پاس چلی گئیں، تو گویا دونوں شادیوں میں انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ دوسری ٹھوکر بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی، اس لئے انھوں نے پھر شادی نہیں کی — لیکن شادی میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میاں بیوی کا غلط انتخاب زندگی کو اس قدر برباد کر دیتا ہے؟

۸ رمئی

حمید حسن سے میری نسبت ہوئی ہے مجھے وقتاً فوقتاً خط لکھتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے، پہلے وہ اپنی برتری جتاتے تھے، مگر میرے ٹوکنے پر انھوں نے تھوڑے عرصے کے لئے اپنا رویّہ بدل لیا۔ لیکن جب سے وہ پی اے ایس امتحان میں شریک ہوئے ہیں، انھوں نے پھر شیخی بگھارنی شروع کر دی ہے ان کے خیالات میں چھچھورپن ہے اور ان کی نظر میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں معلوم ہوتی، دس پندرہ دن ہوئے میں نے انھیں پھر لکھا کہ آپ یہ نہ بھولئے، عورت بھی انسان ہے اور شریف انسان عزتِ نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے بس اس بات نے جیسے شتابہ چھوڑ دیا چنانچہ اب کے جو خط آیا ہے اس میں وہ بدتمیزی پر اتر آئے ہیں اور مجھے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ میں عنقریب ان کی بیوی بننے والی ہوں، اس لئے مجھے ایسی کوئی بات نہیں لکھنی چاہئے جو ان کی شان میں گستاخی ہو، انھوں نے میرے اس خیال کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ میں ایم اے میں پولٹیکل سائنس لوں گی اور تاکید کی ہے کہ میں اب مزید تعلیم کا سودا اپنے دماغ سے نکال دوں، آخر میں انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے

کہ میں بے حجابی اور بے باکی یکسر ترک کردوں اور شریفوں کی سی خو بو پیدا کر لوں تاکہ جب ان کے نکاح میں داخل ہوں تو ہر لحاظ سے ان کے لائق بن جاؤں ـــ اس خط کو پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دامن پکڑ کر گھسیٹا ہے، جی میں آئی اس خط کے پرزے پرزے کردوں اور انھیں لکھ بھیجوں کہ آئندہ آپ مجھے کوئی خط نہ لکھئے، لیکن اس سے ان کا کیا بگڑتا؟ میں غصے سے کڑی کھڑی کانپتی رہی اور جب تک میں نے اس کا جواب نہیں لکھ لیا مجھے قطعی تسلی نہیں ہوئی۔

۴ جون۔

میرا خط پڑھ کر حمید آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ اس دفعہ اس نے خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی مجھے کبھی توقع نہ تھی۔ کیا وہ اس قدر گرا ہوا ہے، جو اس نے مجھے ممی کا طعنہ دیا ہے؟ اس نے لکھا ہے "اتنا مغرور ہونا اچھا نہیں، ایسی بدزبان نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ شبہ ہونے لگے کہ تم اپنی فرنگن ماں کے نقش قدم پر چلو گی" یہ اس نے خط نہیں لکھا، میرے دل پر گھونسہ مارا ہے، شادی کے بعد تو وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے گا، اٹھتے بیٹھتے ممی کے طعنے دے کر مجھے کچو کے دیا کرے گا، میری حالت کو کیا ہو گیا ہے۔ رونا چاہتی ہوں تو آنسو نہیں نکلتے، چیخنا چاہتی ہوں تو فریاد حلق میں اٹک جاتی ہے، ضبط کرتی ہوں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ ڈیڈی، اے ڈیڈی! کیا آپ مجھے اس مردود سے بیاہ دیں گے؟ اس خناس سے، جو ابھی سے مجھے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے؟ کیا یہ شریف آدمی ہے؟ کیا یہ کبھی مجھے رفیقۂ حیات سمجھے گا؟

۱۴ اگست

آج جشن پاکستان ہے۔ چاروں طرف خوشیاں ناچ رہی ہیں، میری قوم کو آج کے دن آزادی ملی تھی اور میں بھی آج آزاد ہوئی ہوں۔ شب و روز سوچتے سوچتے آخر صبح میں نے ڈیڈی کو حمید کے خطوط دکھا دیئے، میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اور پیشتر اس سے کہ میں کچھ کہتی ڈیڈی نے نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں یہ منگنی ابھی توڑے دیتا ہوں۔"

آزادی کتنی بیش بہا شے ہے اسے میرا دل سمجھتا ہے، سچ کہتی ہوں، کل مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے کال کوٹھری میں ڈھکیل دیا ہے، میری راتیں اندھیری ہوتی جا رہی ہیں اور اب افق حیات پر صبح آزادی کا پرچم کبھی لہراتا ہوا نہیں دیکھوں گی، مگر ڈیڈی، پیارے ڈیڈی نے میری قید کی طنابیں کاٹ ڈالی ہیں، انھوں نے غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے پر ضرب کاری لگا کر چراغ نور پاش نصب کیا ہے، ہاں اب وہ سیاہی میری زندگی کے مطلع سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہے میرے سامنے آزادی کا سورج لب بام جگمگا رہا ہے۔ آج ۱۴ اگست ہے۔

۲۳ اکتوبر۔

یہ سارا ہفتہ بڑا لطیف و پرکیف گذرا، صبح و شام سیر و تفریح، دن رات خوش کن باتیں، میری عم زاد بہن کے شوہر، جنھیں میں بھائی صاحب کہتی ہوں، جب کراچی آتے ہیں تو گویا عید آجاتی ہے وہ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں کوئی پینتیس چالیس سال عمر ہوگی، مگر صحت مند اور جامہ زیب ایسے ہیں کہ بالکل نوجوان لگتے ہیں، طبیعت ایسی شگفتہ پائی ہے کہ ہر وقت کنول کا کھلا ہوا پھول معلوم ہوتے ہیں شستہ آدمی سے انھیں چڑ ہے، خود اس قدر چست و چالاک ہیں کہ جوانی کا سماں باندھ دیتے ہیں، ان کی زندگی رواں دواں

ہے، ان کی گفتگو بھنہ ریزنا ایشا ہے، جو دسے انھیں وحشت ہوتی ہے، ان دنوں انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی، چچا زاد اور پھوپی زاد بہنیں، بھائی، بھاوجیں اور کنبے کے دولہا، وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر گئے، کبھی کلفٹن کے ساحل پر، کبھی ملیر کے باغوں میں، کبھی ہم سینڈز پٹ کی لہروں میں گھنٹوں کھیلتے رہے، کبھی ہم نے ہوکس بے کی دلکش شاموں کا لطف اٹھایا، جب دن ہم گھر سے نہیں نکلے، تو ہم نے سینما دیکھا ہندوستانی فلم بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں، ان میں بے حیائی رچتی جا رہی ہے جسے دیکھ کر بعض دفعہ تو سینہ دھڑکنے لگتا ہے۔

اب کے میں نے ایک نئی بات محسوس کی، بہنوں، بھاوجوں یا بھائیوں میں اگر کوئی مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے تو بھائی صاحب فوراً میری حمایت کرتے ہیں، انھوں نے کئی مرتبہ کہا " بھئی بنت قمر پھول ہے ۔ اسے کوئی رنج دیا یا کرو ورنہ یہ کمھلا جائے گی، اور ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے " اب کے تم مجھے بہت یاد آؤ گی !" بھائی صاحب مجھے بے حد چاہتے ہیں، ان کے پیار میں خلوص اور بزرگی میں حمایت و حفاظت ہے، لیکن انکی گھریلو زندگی کیوں تابناک نہیں؟ آپا نہ جانے کیسی بیوی ہیں! دل کی اتنی پیاری، پر زبان کی کڑوی، ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتی ہیں اور بھائی صاحب ہر دفعہ مسکرا کر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں بڑا صبر و ضبط ہے لیکن آپا ان کے سامنے اتنی چڑچڑی کیوں ہو جاتی ہے؟ کیوں صرف انھی سے بدمزاجی کرتی ہیں؟ باقی سب کے ساتھ باتیں کرتی ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں، باجی سے ان کی بڑی دوستی ہے دونوں پرانی سہیلیاں بہنیلیاں ہیں وہ ان سے رازدارانہ دوپہر کو باتیں کر رہی تھیں، میں نے چپکے چپکے سنا، کہ بھائی صاحب کو خوبصورت عورتیں بڑی پسند ہیں اسلئے وہ ان پر شک رکھتی ہیں، لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا کہ بھائی صاحب آوارہ ہیں بدچلن ہیں

خدا معلوم، یہ میاں بیوی کا تعلق کیسا ہے؟ چاہے دونوں میں اچھی نبھتی ہو، لیکن اندر سے ٹوٹا جائے تو یہ جس سے سالاں، وہ اس سے شاکی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہاں میرے پھوپی زاد بھائی ہیں، امانت مرزا وہ اپنی بیوی کو خوب چاہتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی محبت کا اظہار اتنی شدومد سے کرتے ہیں کہ عجیب سا لگتا ہے، مگر کسی کو اس سے کیا۔ وہ خود تو اپنی بیوی کے پرستار ہیں اور ان کی بیوی ان پر جان چھڑکتی ہیں، دراصل امانت بھائی مولوی طبیعت کے ہیں، نماز کبھی قضا نہیں کرتے اور سارے شرعی احکام کی باقاعدہ تعمیل کرتے ہیں، اگرچہ ابھی ادھیڑ عمر کے ہوں گے مگر ان کا حلیہ دن بہ دن اسلامی ہوتا چلا جاتا ہے، ماتھے پر سجدوں کا نشان، بھرواں ڈاڑھی، کتری ہوئی لبیں اور کثیر الاولاد، یعنی اللہ میاں کی ساری برکتیں انھیں میسر ہیں۔ پچھلی دفعہ جب ہم سیر کو گئے تو ہم ایک دن سمندر میں اتر کر پانی سے خوب کھیلی تھی، سب ہی ہنسنے بولنے میں مشغول تھے میں نے ایکا ایکی جو نظر اٹھائی تو امانت بھائی میری پنڈلیوں کو جو پائینچے سمٹنے سے کھل گئی تھیں بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا، پھر بھی میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کی نظریں مجھ پر اکثر جمی رہتی ہیں۔ آخر وہ مجھے یوں کیوں دیکھنے لگے ہیں — مگر نہیں، یہ میرا واہمہ ہوگا۔ وہ بیاہتا ہیں۔ اور اپنی بیوی پر فدا ہیں۔

۲۱ جنوری

اس دوران میں میری کئی نسبتیں آئیں مگر ڈیڈی نے میرے لئے جو رشتہ پسند کیا ہے وہ سب سے

بنت قمر

صادق الخیری

اچھا ہوگا۔ ایک دن پھوپھی چھوٹی چچی سے کہہ رہی تھیں "خدا کرے قمر کے سہرے کے پھول جلدی کھلیں، بھائی بڑے متفکر رہتے ہیں۔" لیکن ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ ماں باپ کیوں چاہتے ہیں کہ بیٹی جلدی ان کے گھر سے چلی جائے۔ اور میرے ڈیڈی تو مجھ کو اتنا چاہتے ہیں کیا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ کرکے رنجیدہ نہیں ہوں گے۔ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے دولہا کے پاس چلی جاؤں گی تو وہاں ہمیشہ مسرور و شاداں رہوں گی۔

۶ فروری

اس وقت میں بڑی مشکل سے، اپنے کو سنبھالے ہوئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں، پرسوں ... میری زندگی میں ایسا طوفان آیا۔ جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیئے ہیں، رات کو میں حسب معمول بے فکری کی نیند پڑی سو رہی تھی کہ . . . . میں کیسے لکھوں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پر کوئی بے تابی سے ہاتھ پھیر رہا ہے خوف سے میری زبان گنگ ہو گئی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، لیکن میں کشمکش کرتی رہی اور وہ چلتا ہوا ہاتھ، کبھی میری باہوں، کبھی کمر اور کبھی پنڈلیوں کی طرف بڑھتا رہا، ذرا دیر میں میری ہمت واپس آئی تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ــــ یہ دہکتا ہوا ہاتھ یہ بھبکتا ہوا چہرہ ــــ بھائی امانت مرزا کا تھا، مولوی امانت کا، اور وہ دم بدم مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے مچلے جا رہا تھا میں نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی، مگر کسی نے فوراً میرے کان میں کہا۔ "ایسا نہ کرنا ایسا نہ کرنا، تم بدنام ہو جاؤ گی ـــ تم عورت ہو!" میرا دماغ ماؤف ہو گیا میری قوت فیصلہ جواب دے گئی اور مجھے بے حس و حرکت پاکر، اس عفریت نے مجھے ننگا کرنا چاہا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے "چھوڑ دے، ظالم مجھے چھوڑ دے میں تیری بہن ہوں، دیکھ برابر کے کمرے میں تیری بیوی جاگ جائے گی . . . . . خدا کے لئے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا، میری شادی ہونے والی ہے، میرے کنوار پنے کو بے داغ رہنے دے میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" ــــ لیکن یہ سب باتیں میری زبان سے نہیں نکلیں اور وہ شیطان اپنی مکروہ صورت میرے چہرے کے قریب تر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر دفعتاً میرے کانوں نے سنا کہ میری زبان میں گویائی آگئی ہے اور میری روح چیخ کر فریاد کر رہی ہے "ڈیڈی!"

اس کی گرفت بحضت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے گہرے گہرے سانس بھاری ہوتے گئے، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں دم بخود بستر پر پڑی دیکھتی رہی کہ وہ چوروں کی طرح، دبے پاؤں، لڑکھڑاتا ہوا میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

۱۰ فروری

میں کئی دن سے اپنے کمرے میں الگ تھلگ پڑی ہوں غصے، حیرت اور رنج نے مجھے شل کر دیا ہے۔ جی میں طرح طرح کی باتیں آتی ہیں۔ سوچتی ہوں کہ جا کر ڈیڈی یا پھوپھی سے کہہ دوں، پھر خیال آتا ہے، اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا، نہ جانے ڈیڈی کیا کر گذریں، اور خود امانت کی بیوی کا کیا حال ہوگا جو اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ میرا شوہر میرا عاشق ہے۔ یہ بات کھل گئی تو صرف انہی کی نہیں، سارے خاندان کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی، گھر کے کسی فرد پر کسی کو بھروسہ نہیں رہے گا۔ اندیشہ ہائے دور دراز مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، کم حوصلگی اور مصلحتوں نے میرے لبوں پر مہر خاموشی لگا دی ہے، لیکن میں امانت کو ہرگز معاف نہیں کروں گی، اس لئے میری

عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔

۱۵ر فروری

وقت تیزی سے پرواز کر رہا ہے، آج سو کر اٹھی تو دل کا بوجھ قدرے ہلکا تھا، ڈیڈی نے کہا "تمہاری طبیعت کئی دن سے شکست ہے، تم میرا کہا کیوں نہیں مانتیں؟ آج ڈاکٹر کو ضرور بلوالو" ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ اگر یونہی منہ لپیٹے لیٹی رہتی تو ان کو ناحق پریشانی ہوتی چنانچہ میں نے روزانہ کا معمول شروع کر دیا ہے۔

سہ پہر کو کالج سے واپس آئی تو نیچ کے کمرے میں وہ صاحب ایمان، امانت جا نماز پر کھڑا تھا، میرے پاؤں بلا ارادہ رُک گئے، اور اس نے معانقت توڑ کر میری طرف دیکھا، میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور میں تیزی سے اس کے پاس پہنچی۔ تو اس نے چھوٹتے ہی کہا "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، بہت دن سے دل کے ارمان دل میں دبے ہیں ــــ" میں غصے سے بے قابو ہو گئی "عنقریب میں شادی شدہ ہو کر ۔ ۔ ۔ ۔" میری زبان نے آگے ساتھ نہ دیا اور وہ نشکل کا مولوی چرب زبانی سے بولا "تم راضی ہو جاؤ، تو میں فیروزہ کو چھوڑ دوں گا، اور ــــ" یہ تو حد ہو گئی۔ مجھے ایک دھکا سا لگا، اور میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ــ "تو کمینہ ہے" ــــ (اتنے میں بھابی فیروزہ کی دور سے مسرور لہجے میں آواز — "بھئی ہم دیکھا تم جو میرے لئے آج چکن لائے ہو، وہ واقعی لاجواب ہے"

میرا خیال خود بخود بھابی فیروزہ کی طرف چلا گیا، جو صحن میں بیٹھی چھپا چھپ چکن کا کرتہ سی رہی تھیں لیکن انھیں نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا دم بھرنے والا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر، چاہے جس وقت انھیں لات مار کر گھر سے باہر نکال دے گا۔ اس تصور نے میرے غصے کو فرو کر دیا اور میں نے حسرت سے اس ملعون کی طرف دیکھا، جو میری خشمگی اور بیوی کے ڈر سے مصلے پر بیٹھے بیٹھے رکوع میں چلا گیا تھا۔

۲۸ر فروری

وہ جو پنج وقتہ نمازی، پرہیزگار، مولوی امانت ہے، اس کی بزرگی کا بُت زمین پر اوندھے منہ گر پڑا ہے، پہلے میں اس کا جس قدر احترام کرتی تھی اب اتنا ہی اس کو ذلیل سمجھتی ہوں، عمر کے تفاوت اور اس کے مذہبی ڈھکوسلے کے سبب پہلے مجھ پر اس کا بڑا رعب تھا اب میں نڈر ہو گئی ہوں اور اسے بڑی حقارت و نفرت سے دیکھتی ہوں، وہ میری نظروں کو پہچانتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا، احتجاج تک نہیں کرتا۔

۱۴ر اپریل

کوئٹے سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے، ڈیڈی کو اور مجھے بلایا ہے، لکھا ہے یہاں موسم بڑا دلکش ہے، یہاں کی آب و ہوا آپ کے لئے مفید ہوگی، ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا "تم چلو گی"؟ میں نے کہا "شوق سے چلوں گی" بھائی صاحب مجھے اکثر یاد آتے ہیں، اور آپا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

۱۵ر مئی

سنگ زار بلوچستان کا دور دور تک پھیلا ہوا اپنے آب و گیاہ علاقہ بڑا بے رونق ہے، راستے میں خشک چٹانیں بدصورت ٹیلے اور بے ہنگم پہاڑیاں دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی، مگر جب ہم کوئٹہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس لحیم شحیم بھونڈے اور بھدے جسم کے اندر بھی ایک دل ہے، نازک شاداب اور حسین، یہ ایک ایسا نخلستان ہے جہاں شیریں پانی کے چشمے بہتے ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، جہاں ساری فضا پرسکون

اچھا ہوگا۔ ایک دن پھوپھی چھوٹی چچی سے کہہ رہی تھیں "خدا کرے قمر کے سہرے کے پھول جلدی کھلیں، بھائی بڑے متفکر رہتے ہیں۔" لیکن ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ ماں باپ کیوں چاہتے ہیں کہ بیٹی جلدی ان کے گھر سے چلی جائے۔ اور میرے ڈیڈی تو مجھ اتنا چاہتے ہیں کیا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ کر کے رنجیدہ نہیں ہوں گے۔ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے دولہا کے پاس چلی جاؤں گی تو وہاں ہمیشہ مسرور و شاداں رہوں گی۔

۶ فروری

اس وقت میں بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالے ہوئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں، پرسوں۔۔۔ میری زندگی میں ایسا طوفان آیا۔ جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیئے ہیں، رات کو میں حسب معمول بے فکری کی نیند پڑی سو رہی تھی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے میں کیسے لکھوں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پر کوئی بے تابی سے ہاتھ پھیر رہا ہے خوف سے میری زبان گنگ ہو گئی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، لیکن میں کشمکش کرتی رہی اور وہ جلتا ہوا ہاتھ، کبھی میری باہوں، کبھی کمر اور کبھی پنڈلیوں کی طرف بڑھتا رہا، ذرا دیر میں میری ہمت واپس آئی تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ـــــ یہ دہکتا ہوا ہاتھ یہ بھبکتا ہوا چہرہ ـــــ بھائی امانت مرزا کا تھا، مولوی امانت کا، اور وہ دم بہ دم مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے مچلے جا رہا تھا میں نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی، مگر کسی نے فوراً میرے کان میں کہا۔ "ایسا نہ کرنا ایسا نہ کرنا، تم بدنام ہو جاؤ گی۔" ـــ "تم عورت ہو" میرا دماغ ماؤف ہو گیا میری قوت فیصلہ جواب دے گئی اور مجھے بے حس و حرکت پا کر، اس عفریت نے مجھے ننگا کرنا چاہا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے "چھوڑ دے، ظالم مجھے چھوڑ دے میں تیری بہن ہوں، دیکھ برابر کے کمرے میں تیری بیوی جاگ جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کے لئے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا، میری شادی ہونے والی ہے، میرے کنوارپنے کو بے داغ رہنے دے میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" ـــ لیکن یہ سب باتیں میری زبان سے نہیں نکلیں اور وہ شیطان اپنی مکروہ صورت، میرے چہرے کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا رہا، پھر دفعتاً میرے کانوں نے سنا کہ میری زبان میں گویائی آگئی ہے اور میری روح چیخ چیخ کر فریاد کر رہی ہے "ڈیڈی!"

اس کی گرفت یکلخت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے گہرے گہرے سانس بھاری ہوتے گئے، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں دم بخود بستر پر پڑی دیکھتی رہی کہ وہ چوروں کی طرح، دبے پاؤں، رکتا، رکتا، میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

۱۰ فروری

میں کئی دن سے اپنے کمرے میں الگ تھلگ پڑی ہوں، غصے، حیرت اور رنج نے مجھے شل کر دیا ہے۔ جی میں طرح طرح کی باتیں آتی ہیں۔ سوچتی ہوں کہ جا کر ڈیڈی یا پھوپھی سے کہہ دوں، پھر خیال آتا ہے، اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا، نہ جانے ڈیڈی کیا کر گذریں، اور خود امانت کی بیوی کا کیا حال ہوگا جو اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ میرا شوہر میرا عاشق ہے۔ یہ بات کھل گئی تو صرف انہی کی نہیں، سارے خاندان کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی، گھر کے کسی فرد پر، کسی کو بھروسہ نہیں رہے گا۔ اندیشہ ہائے دور دراز مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، کم حوصلگی اور مصلحتوں نے میرے لبوں پر مہر خاموشی لگا دی ہے، لیکن میں امانت کو ہرگز معاف نہیں کروں گی، اس نے میری

ضعف کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔

۱۵ فروری

وقت تیزی سے پرواز کر رہا ہے۔ آج سو کر اٹھی تو دل کا بوجھ قدرے ہلکا تھا، ڈیڈی نے کہا "تمہاری طبیعت کئی دن سے سُست ہے، تم میرا کہا کیوں نہیں مانتیں؟ آج ڈاکٹر کو ضرور بلوا لو" ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ اگر یوں ہی منہ لپیٹے لیٹی رہتی تو ان کو ناحق پریشانی ہوتی بچا بچنہ میں نے روزانہ کا معمول شروع کر دیا ہے۔

سہ پہر کو کالج سے واپس آئی تو بیچ کے کمرے میں وہ صاحب ایمان، امانت جا نماز پر کھڑا تھا، میرے پاؤں بلا ارادہ رُک گئے، اور اس نے معافیت توڑ کر میری طرف دیکھا، میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور میں تیزی سے اس کے پاس پہنچی، تو اس نے چھوٹتے ہی کہا "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، بہت دن سے دل کے ارمان دل میں دبے ہیں ـــــــ" میں غصے سے بے قابو ہو گئی "عقربی شادی شدہ ہو کر . . . " میری زبان نے آگے ساتھ نہ دیا اور وہ شکل کا مولوی چرب زبانی سے بولا "تم راضی ہو جاؤ، تو میں فیروزہ کو چھوڑ دوں گا، اور ــــــ" یہ توحد ہو گئی۔ مجھے ایک دھکا سا لگا۔ اور میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ــــ "تو کمینہ ہے" ــــــ (اتنے میں بھابی فیروزہ کی دور سے مسرور لہجے میں آواز آئی "تم نے دیکھا تم جو میرے لئے آج چکن لائے ہو، وہ واقعی لاجواب ہے")

میرا خیال خود بخود بھابی فیروزہ کی طرف چلا گیا، جو صحن میں بیٹھی چھپا چھپ چکن کا کرتہ سی رہی تھیں لیکن انھیں نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا دم بھرنے والا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر، چاہے جس وقت مجھے لات مار کر گھر سے باہر نکال دے گا، اس تصور نے میرے غصے کو فرو کر دیا اور میں نے حسرت سے اس ملعون کی طرف دیکھا، جو میری خشمناکی اور بیوی کے ڈر سے، مصلّے پر بیٹھے بیٹھے رکوع میں چلا گیا تھا۔

۲۸ فروری

وہ جو پنج وقتہ نمازی، پرہیزگار، مولوی امانت ہے، اس کی بزرگی کا بُت زمین پر اوندھے منھ گر پڑا ہے، پہلے میں اس کا جس قدر احترام کرتی تھی اب اتنا ہی اس کو ذلیل سمجھتی ہوں، عمر کے تفاوت اور اس کے مذہبی ڈھکوسلے کے سبب پہلے مجھ پر اس کا بڑا رعب تھا اب میں نڈر ہو گئی ہوں اور اسے بڑی حقارت و نفرت سے دیکھتی ہوں، وہ میری نظروں کو پہچانتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا، احتجاج تک نہیں کرتا۔

۱۴ اپریل

کوئٹے سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے، ڈیڈی کو اور مجھے بلایا ہے، لکھا ہے یہاں موسم بڑا دلکش ہے، یہاں کی آب و ہوا آپ کے لئے مفید ہو گی، ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا "تم چلو گی"؟ میں نے کہا "شوق سے چلوں گی" بھائی صاحب مجھے اکثر یاد آتے ہیں، اور آپا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

۱۵ مئی

سنگ زارِ بلوچستان کا دور دور تک پھیلا ہوا بے آب و گیاہ علاقہ بڑا بے رونق ہے، راستے میں خشک چٹانیں بدصورت ٹیلے اور بے ہنگم پہاڑیاں دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی، مگر جب ہم کوئٹہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس لحیم شحیم بھونڈے اور بھدے جسم کے اندر بھی ایک دل ہے، نازک شاداب اور حسین، یہ ایک ایسا نخلستان ہے جہاں شیریں پانی کے چشمے بہتے ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، جہاں ساری فضا پرسکون

اور خیال افروز ہے۔

کوئٹہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے، جہاں امیر بہت زیادہ آسودہ حال اور غریب بہت زیادہ فلاکت زدہ ہے، یہاں کانیں ہیں، منڈیاں ہیں، تجارت ہے، یہاں مزدوری ہے، چاکری ہے مفلسی ہے سیلانیوں کے لئے عیش ہیں، پھلوں اور گوشت کی فراوانی ہے۔ بلوچیوں کے لئے جفاکشی ہے، محرومی ہے اور آمدنی کی نایابی، اتنی کہ وہ بمشکل روٹی کو پانی میں بھگوکر کھاتے ہیں۔ لیکن خدا نے انھیں غیرت سے مالا مال کیا ہے شکستہ پائی اور بوسیدہ حالی کے باوجود، وہ تندرست و توانا ہیں ان میں خون کی کمی نہیں، انھیں طاقت کی دوا نہیں چاہیئے، انھیں قدم قدم پر احتیاطوں کی ضرورت نہیں، وہ جو یہاں روپیہ کمانے آئے ہیں، عزت سے اپنی خوابگاہوں میں آرام کرتے ہیں، بلوچ زادے میزبانوں کے بھیس میں آنیوالوں کی خاطر، خون پسینہ ایک کرکے اپنے گھر کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور خود الگ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لے جاؤ، یہ سیم و زر تمہارا ہے۔ اس پر تمہارا ہی حق ہے، تم اتنی دور سے چل کر جو اسے لینے آئے ہو! دولت مند کھٹکے لگاتا ہے اور غریب بلوچی آسمان کی طرف منھ اٹھاکر دیکھنے لگتا ہے کہ کب تک یہ جہالت کا اندھیرا چھایا رہے گا؟ کب علم کی روشنی یہاں تک پھیلے گی؟ کب خدا ہمیں احساس اور اہمیت دے گا کہ ہم اپنی دولت سے خود متمتع ہوں؟

۳۰ مئی

یہاں کئی قدرتی سیرگاہیں ہیں جہاں انسان بازاروں کی گہما گہمی اور ٹریفک کے ہنگاموں سے محفوظ ہوکر اپنے تفکرات بھول جاتا ہے۔ مجھے یہ خاموش مقامات ہمیشہ یاد رہیں گے خصوصًا ہروری جہاں ہم لوگ کل پک نک کے لئے گئے تھے، یہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک عمدہ تفریح گاہ ہے، جہاں چٹانیں اور پہاڑیاں اس طرح آگے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑی ہیں گویا انھیں کسی خاص مقصد سے ترتیب دیا گیا ہے ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں بھائی صاحب، ڈیڈی، آپا، بچے اور ملازم شامل تھے، ہروری کے دامن میں چوٹی کی طرف خراماں خراماں آگے بڑھتا جاتا اور ہمارا راستہ کبھی کشادہ، کبھی تنگ اور کبھی پھر وسیع ہو جاتا تھا دائیں جانب ایک لمبی پختہ نالی تھی جس میں چشمے کا شفاف پانی اچھلتا، ناچتا گاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا، ہم اس آب رواں کا مخرج نہ دیکھ سکے، جو کہیں بلندی پر پہاڑیوں میں چھپا ہوگا، لیکن وہ ہم سے بے خبر اپنی منزل کی طرف مصروف سفر تھا، جو بہت دور نیچے آبادی میں تھی، چلتے چلتے بچے تھک جاتے تو کسی کی گود میں آجاتے، آپا کچھ تھک سی گئی تھیں، ڈیڈی بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور بھائی صاحب حسب معمول لطیفے سنا سنا کر ہمیں، اور آگے بڑھنے پر اکسا رہے تھے کہ اتنے میں ایک بڑا سا میدان آیا جس کے ایک جانب اونچی اونچی پہاڑیوں کے دو سلسلے حبش کے دو قد آور غلاموں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے، معلوم نہیں ان کے درمیان راستہ قدرتی تھا یا قرنوں پیشتر انسانی ہاتھوں نے پتھر کے سینے کو چیر کر اسے بنایا تھا۔ کیا خبر غیر متمدن ہندستان کو فتح کرنے والے جانباز سنکڑوں سال پہلے اسی راہ پر گامزن ہوئے ہوں اور اس وقت ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے یہ سارا سلسلہ کوہ گونج اٹھا ہو، جب ہم اس درے سے گذر کر باہر آئے تو آپا کی ہمت نے

اب دے دیا اور ڈیڈی نے ایک اونچی سی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا کہ یہیں ہمارا ڈیرہ جمے گا، دن بھر سب ل گھومتے پھرتے رہے، بچے روتے کھیلتے رہے، آپا کھانا کھلا کر فارغ ہوئیں تو بچوں کو لے کر بیٹھ گئیں اور ڈیڈی نب بینی میں مشغول ہو گئے، میرا دل اس ماحول سے کسی طرح نہیں بھرتا تھا، دور دور تک ہوآنے کے باوجود میری بیعت یہی چاہتی تھی کہ ابھی اور چلوں ابھی اور دوڑوں بھاگوں، سب تھک کر سستانے بیٹھ گئے، مگر بھائی حب نے میرا برابر ساتھ دیا، بلکہ جب میں نے ڈیڈی سے کہا کہ بس سامنے والی پہاڑی کے اوپر اور ہو آؤں، تو ں وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری، چنانچہ جب ہم منزل منزل چوٹی پر پہنچے تو میرا سانس پھول گیا، ائیصاحب بھی ہانپنے لگے تھے اس لئے ہم ایک کالی سی عمودی چٹان کی اوٹ میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے بلوں پرے نشیب میں کوئٹہ کی چھوٹی سی آبادی سبزے میں گھری ہوئی نظر آرہی تھی، جگہ جگہ پھولوں کے باغات مڑے لہلہا رہے تھے، دور دراز سے آنے والی ہوا اپنے دوش پر جنگلی پھولوں کی خوشبو اور بلوچستان کی لی لئے آ رہی تھی، ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں دور و نزدیک ایک طلسم سا بندھا تھا اور اس میں گم ہو کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اسی جگہ کے لئے پیدا ہوئی ہوں، یہ چٹانیں، یہ بلندیاں، یہ خاموشی، یہ پُرسکون مقام تنا امن ہے یہاں! کتنی آزادی ہے اس ماحول میں! اور جب میں اپنے خواب سے چونکی تو آپ ہی آپ میرا سر بھائی صاحب کے شانے پر آ گیا، وہ بڑی ملائمت سے بولے "کس گہری سوچ میں ہو، واپس نہیں چلو گی؟" میں نے جواب دیا "ذرا اور ٹھہر جائیے میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا" پھر ہم دونوں قدرت کی بوقلمونیوں ور زندگی کے اُجلے رخوں پر باتیں کرنے لگے، ایسی باتیں جن میں شیرینی اور خلوص تھا، ہمدردی اور ہم خیالی تھی اور جب سورج ارغوانی ہونے لگا تھا تو بھائیصاحب نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا، ان کے کندھے پر سر رکھ کر، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ان کے اتنے قریب بیٹھ کر مجھے بڑی راحت ہوئی۔ افسوس یہ وقت کتنی جلدی گزر گیا۔

۱۵ جون۔

آپا کو اللہ نے ایک اور چاند سا بیٹا دیا ہے۔ بالکل جینی کا ہوا لگتا ہے۔ مسکراتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے، ہمکتا ہے تو جی چاہتا ہے سینے سے چمٹا لوں، بھائیصاحب کے سب بچے پیارے پیارے ہیں مگر یہ سب سے بڑھ گیا، اس کے خدوخال بھائی صاحب کے سے ہیں اسکی آنکھوں میں ان کی جھلک ہے، مجھے ننھے بچے اچھے نہیں لگتے۔ وہ کلبلاتے ہیں تو مجھے پھریریاں سی آتی ہیں، مگر بھائیصاحب کا یہ منا مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے آپ ہی آپ مجھے اس پر پیار آتا ہے، پرسوں ہم لوگ واپس جا رہے ہیں، روانگی کے خیال سے میں افسردہ ہو گئی ہوں، کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکتی۔

۳ جولائی

۱۶ تاریخ کو میری شادی ہے جوں جوں دن قریب آتا جاتا ہے، شوق اور وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ خدا جانے ایوب کس مزاج کے آدمی ہیں ان کے خیالات کیسے ہیں، ان کے رجحانات کیا ہیں اور ہم دونوں کی کیسی نبھے گی؟ صبح میں نے ان کی تصویر بھی دیکھی، بڑے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں، طبیعت کھلی ہوگی، میں کوشش

کروں گی کہ ہم جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھیں۔ تو ہمارا مستقبل ضرور خوش آئند ہوگا۔ لیکن سب ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتی ہوں، تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر شادیاں ناکام ہیں۔ میاں بیوی کے جذبات و احساسات میں ہم آہنگی نہیں، وہ درگزر چشم پوشی اور فراخدلی کو اپنی عادت نہیں بناتے۔

یکم ستمبر

الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ شادی کے نام سے مجھ پہ یہ کیسا ستم ٹوٹا ہے؟ ایوب میں تو سرے سے آدمیت ہی نہیں، وہ تو انسان کا نقلی چہرہ لگا کر، مجھے بیاہنے آیا تھا، وہ سرتاپا حیوان ہے، اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتا ہے شروع میں تو میں ہکا بکا رہ گئی اور سوچتی رہی کہ مرد اور عورت کا یہ رشتہ آخر بنا کیوں ہے؟ عورت کو پا کر مرد کیوں بلندیٔ خیال اور پاکیزگیٔ نفس سے محروم ہو جاتا ہے؟ کیوں تنہائی میں، وہ اشرف المخلوقات نہیں رہتا؟ لیکن سب مرد تو ایسے نہ ہوتے ہوں گے، یہ ایوب ہی ہے جو صرف میرے جسم کی لذت چاہتا ہے۔ وہ میرے دل میں کبھی نہیں اترتا، میں اس سے بات کرتی ہوں، تو کوئی اثر نہیں لیتا، اُسے صرف میرا حُسن چاہئے حُسن، اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جب کچھ عرصے بعد میں بھی دوسری عورتوں کی طرح بھدی اور بے ڈول ہو جاؤں گی، تو وہ مجھ سے بیزار ہو جائے گا، مجھے مجبور و مقہور چھوڑ دے گا۔

ایوب ریچھ کی طرح ہے، اس کے سینے پیٹھ، ہاتھوں بلکہ سارے جسم پر اس قدر بال ہیں کہ دیکھ کر کراہیت ہوتی ہے، وہ جب اپنے ہاتھ میری طرف بڑھاتا ہے تو میرے بدن پر سینکڑوں چھپکلیاں رینگ جاتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ کمرے سے نکل بھاگوں اور کہیں روپوش ہو جاؤں، لیکن ایسا نہیں ہوتا میں ہنوز اپنی سسرال میں قید ہوں، میری سہیلیاں بھی یہاں نہیں، جو میرے دل کا حال سُن سکیں، جن سے میں پوچھ سکوں "سچ بتاؤ، کیا بیوی اسی کو کہتے ہیں؟"

۲ اکتوبر

میں نے کنوارپنے میں شادی کے جو محل بنائے تھے وہ ڈھے گئے ہیں، ایوب جنگلی اوباش ہے۔ اُسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، وہ مجھ سے یوں پیش آتا ہے، جیسے میں اس کی رفیقہ حیات نہیں، بس ایک عورت ہوں اس کے دل میں بہت سی عورتیں ہیں، اور جب کسی عورت کا خیال، جسے وہ نہیں پا سکا، اسے دیوانہ کر دیتا ہے تو وہ اس کا بدلہ مجھ سے اتارتا ہے، کبھی گھسیٹ کر مجھے اپنے سے چپٹا لیتا ہے، کبھی میں مزاحمت کرتی ہوں تو اول فول بک کر دھکا دے دیتا ہے، کل میرے بڑی چوٹ لگی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں خیالات میں کھو گئی اور ہوتے ہوتے مجھے بھائی صاحب اور آپا یاد آ گئے، تو میں نے کہا "آپا، بھائی صاحب کو کچھ نہ کہا کرو۔ تم نے مرد نہیں دیکھے!!"

۲۰ اکتوبر

میں بڑی مشکل سے میکے آئی ہوں، یہ میرا اپنا گھر تھا مگر آج یہ مجھے بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ قدم قدم پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی غیر ہوں، مہمانوں کی طرح میری خاطریں ہوتی ہیں اور بار بار مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ میں بہت جلد اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔ ڈیڈی بھی جو میرے آنے سے بے حد خوش ہیں، موقع دیکھ کر یہی نصیحت کرتے ہیں کہ میرا اصلی گھر میرے شوہر کی دہلیز ہے اور مجھے تمام عمر وہیں رہنا ہوگا جیسے

رخصت کے وقت انھوں نے مجھے سمجھایا تھا، وہ باتیں بالوں میں اب بھی یہی دہراتے ہیں کہ جس شخص سے ایک دفعہ دامن بندھ جائے، ساری زندگی اسی کی ہو کر گذار دینی چاہیئے، یہی شرافت کا تقاضہ اور نسوانیت کا فرض ہے۔ مگر وہ مجھے یہ سبق کیوں دیتے ہیں؟ جی میں آتا ہے۔ ان سے کہدوں ڈیڈی! میں بڑی تکلیف میں مبتلا ہوں میرے اور ایوب کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی اور مفاہمت نہیں۔ . . . نہیں نہیں یہ میں کبھی نہیں کروں گی، انکو اگر شبہ بھی ہو جائے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور کیا خبر طیش میں آ کر وہ میری ماں کا طعنہ دیدیں، کہ میرے خون میں شوہر پرستی کا جذبہ اور شرافت مفقود ہے۔ اسلئے مجھے اپنے کردار پر شرافت کی مہندی لگانی پڑیگی ایوب میری اہانت کریگا، اور میں اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گی، وہ مجھے جلائے گا اور میں مسکراتی رہوں گی۔

۲۵ اکتوبر

کل رات گئے تار آیا کہ ہارٹ فیل ہو جانے سے، ایوب کا انتقال ہو گیا، تھوڑی دیر میں وہاں جانے کے لئے سوار ہو رہی ہوں، دنیا کی رسوم کے مطابق مجھے سوگ کا پیراہن پہننا پڑے گا، لیکن دراصل میں رنجیدہ نہیں ہوں، اس کے یوں اچانک مرجانے کا افسوس ضرور ہے۔

میں عدت پوری کر کے واپس آ گئی ہوں۔ ڈیڈی ایوب کی موت سے بے حد متأثر ہوئے ہیں ان کے دل پر داغ کر بیٹھ گیا ہے کہتے ہیں یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمہاری بیوگی دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا، ان کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرا گھر پھر بسا دیں، مگر میں اب شادی نہیں کروں گی، میرا دل پک گیا ہے۔

امانت مرزا، جو اس عرصے میں اور زیادہ عابد و متقی بن گئے تھے پھر میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے ہیں، ان کو گانے کا بھی شوق ہو گیا ہے اور وقتاً فوقتاً ہجر و فراق کے اشعار آپ ہی آپ گنگناتے رہتے ہیں مگر میں جانتی ہوں کہ یہ عشقیہ کلام کس لئے ہے؟

۵ مارچ

کوئٹہ سے خط آیا ہے کہ بھائی صاحب سخت علیل ہیں، معمولی سی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، ان کی گھبراہٹ اور کم خوابی نے آپا کو پریشان کر دیا ہے، یہ خبر پڑھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا خدا کرے وہ جلد اچھے ہو جائیں، ان کی آئی کسی اور کو آ جائے، ان کی بجائے امانت مر جائے، میں مر جاؤں، اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا، اس تصور سے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے میں کسی ایسی دنیا میں چلی جاتی ہوں، جہاں اچانک خزاں آ گئی ہے، جہاں ہر طرف حسرت اور اداسی چھائی ہوئی ہے، جہاں گل بوٹے نہیں کھلتے، جہاں سبزہ نہیں لہلہاتا، یہ کیسی فضا طاری ہو رہی ہے؟ ایک بھائی صاحب کے نہ ہونے سے، کس نے زندگی کی آرائش نوچ لی ہے، کس نے اس چمن کا سہاگ لوٹ لیا ہے؟ کیوں ایک، صرف ایک شخص کے چلے جانے سے آبشاروں کے نغمے ٹوٹ گئے ہیں، خوشبوؤں کی تابندگی مرٹ گئی ہے، زندگی کا بانکپن غروب ہو گیا ہے؟ ــــ میں ڈیڈی کے ساتھ کوئٹہ جا رہی ہوں، کل صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی، ساری پہاڑ سی رات باقی ہے، ایک ایک پل گذارنا عذاب معلوم ہو رہا ہے ابھی گیارہ ہی بجے ہیں، اتنی دیر سے یہی بج رہا ہے، سوئیاں کیوں تیزی سے نہیں چلتیں، یہ سیاہ شب کیوں جلدی دم نہیں توڑتی؟

صبح ہوتے ہی ہم سوار ہو جائیں گے۔ خدا کرے گاڑی کہیں لیٹ نہ ہو، پرسوں دوپہر تک کوئٹہ پہنچ جائیں گے اور میں سیدھی بھائی صاحب کے پاس چلی جاؤں گی، فوراً ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لوں گی اور آہستہ آہستہ سہلاؤں گی، ان سے باتیں کروں گی، پروری کی پہاڑیوں پر جو ہم نے شام گذاری تھی وہ انھیں یاد دلاؤں گی، انھیں سکون آجائے گا، انھیں ضرور نیند آجائے گی . . . . لیکن لیکن، کوئی میری راہ میں حائل ہو رہا ہے، کہتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ان سب کے سامنے گھُل مل کر باتیں نہیں کر سکتی، ان کے پاس یوں آزادانہ نہیں بیٹھ سکتی، کوئی میرا دل پکڑ کر کھینچتا ہے، میرے اٹھتے قدم کو روکتا ہے — یہ ناصح ٹھیک کہتا ہے۔ یہ میرا نادیدہ ہادی مجھے عرصے سے سمجھا رہا تھا، مگر میں نے اس کی بات کبھی نہیں مانی، میں یہی کہتی رہی ”تو جھوٹا ہے، تو مجھے نہیں سمجھا، میرے دل میں چور نہیں ہے۔ میں بھائی صاحب کو آپا سے چھیننا نہیں چاہتی“۔ اور وہ مجھے یہ جواب دیتا ”تم بیشک سچ کہتی ہو اور میں تمہیں جانتا ہوں، مگر دنیا نہیں جانتی، اسے تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں آئے گا۔ تم جس حد کو توڑ کر آگے جانا چاہتی ہو، وہ بہت سنگین اور بلند ہے، اس سے ٹکراؤ گی تو پاش پاش ہو جاؤ گی“۔ پہلے میں نے اس کا کہا نہ مانا، لیکن ابھی ابھی اس نے یہ بات بھی کہی ہے ”صرف تم ہی برباد نہیں ہو گی، اس کی لپیٹ میں دوسرے بھی آجائیں گے، تمہاری آپا، ان کا ننھا منا گھرانا، تمہارے بھائی صاحب!!“

یہ میرے دل نے بھرپور وار کیا ہے، جس سے میں لیپا ہو گئی ہوں، مجھ میں بغاوت کی بھی ہمت نہیں رہی، میں کوئٹہ جاؤں گی تو دور ہی دور سے انھیں دیکھوں گی، آنکھیں روئیں گی تو آنچل کی اوٹ میں انھیں بہلا لوں گی، مجھے اپنی قسمت معلوم ہو گئی ہے، میرے لئے موسم خزاں آگیا ہے، میں اب چراغِ کشتہ کی مانند خاموش ہو جاؤں گی۔

●

پرویز و نغمانہ

آسمان پر تارے ماند ہو چلے تھے اور چاندنی بے نور ہونے لگی تھی، اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ جیسے آہ بھر کر اپنے غم والم کو ہلکا کرنا چاہتی ہے پھر وہ خالی الذہن ہو کر کھڑی ہو گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اب کیا کرے؟ کہاں جائے۔ اور جب وہ ایک شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح مضمحل اور افسردہ، ڈھلان پر آئی تو خانقاہ کی سمت سے ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ساتھ — اس نے کہیں دور پرویز کے کراہنے اور اپنا نام پکارنے کی آوازیں سنیں۔

جیسے کوئی یکایک خواب سے چونک اٹھے نغمانہ بیتاب ہو گئی اور انتہائی پھرتی سے خانقاہ کی جانب روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے ڈھلان کی طرف جھانکا تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئی کہ پہاڑی کے دامن میں پرویز بے حس و حرکت پڑا ہے۔

صادق الخیری

●

کیمپ کی رات

فکر تونسوی

میں تنبو نمبر ۱۵۱۴ کے باہر کھڑا ہوا ہوں۔

سورج کے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں شرنارتھیوں کے تنبو یوں دکھائی دے رہے ہیں جیسے کسی گھنے جنگل میں درختوں کی لامتناہی، بے ترتیب قطاریں اُگی ہوئی ہوں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق آلود چمک انہیں اور بھی پراسرار بنا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ کسی خواب کا کرشمہ ہوں اور آنکھ کھلتے ہی یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا اور صرف صحرا کی حسرت ناک سائیں سائیں باقی رہ جائے گی جو بڑے بڑے گول دائروں میں اداسی کے ساتھ گھوما کرے گی۔

میں تنبو نمبر ۱۵۱۴ کے کھلے ہوئے مستطیل منہ کے سامنے کسی مجرم کی طرح کھڑا ہوا ہوں، جیسے میرا گناہ ثابت ہو چکا ہے اور اب مجھے اس تنبو کے شیر ایسے منہ کا لقمہ بنانے کی وحشیانہ رسم ادا کی جائے گی۔

تنبو کے اندر سے سسکیوں کے بھن بھنانے کی سی آوازیں باہر آ رہی ہیں۔ ان آوازوں میں ایک دھندلاہٹ سی ہے۔ کوئی فقرہ واضح طور پر گرفت میں نہیں آتا۔ کسی لہجہ میں سیدھے تیر ایسی روانی نہیں ہے۔ آج صبح یہ لوگ اس تنبو میں داخل ہوئے تھے، پانچ چھ شرنارتھیوں کے یہ کنبے۔ اس وقت بھی ان کے چہروں پر ایسی دھند تھی۔ انکی گٹھڑیوں، ٹرنکوں اور بستروں پر دھند تھی۔ وہ یوں قدم دھرتے تھے جیسے وہ دھندلے بادلوں میں چل رہے ہوں ان کی باتوں میں دھند ایسی ملگجی بڑبڑاہٹ تھی۔

وہ اپنی گٹھڑیوں پر زور زور سے دباؤ ڈالتے تھے جیسے انہیں ان گٹھڑیوں کے ٹھوس ہونے کا یقین نہ رہا ہو۔ وہ اپنے اپنے ٹرنکوں کو یکدم اندھوں کی طرح ٹٹولنے لگتے۔ اپنے اپنے کمبلوں، چادروں اور پھٹے ہوئے لحافوں کو بار بار بدن کے ساتھ بھینچ لیتے۔ وہ اپنے شرنارتھی رشتہ داروں پر اُچٹی اُچٹی نگاہیں ڈالتے۔ ان نگاہوں میں ایک شک ہوتا، ایک خوف جُرم کا ایک مبہم سا ہراس۔ وہ اپنے ذہنوں کو برابر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جیسے تازیانے لگاتے رہتے۔ اور اپنی چیزوں، اپنے بچوں، اپنی بیویوں، اپنے خاندان اور اپنی جوان لڑکیوں کو دل ہی دل میں انگلیوں پر گنتے رہتے۔ ہر آدمی چور معلوم ہوتا تھا اور ہر آدمی اس چور کو پکڑ لینے کے لئے چوکنا رہنا چاہتا تھا۔

میں تنبو ۱۵۱۴ کے باہر کھڑا ہوا ہوں۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ تنبوؤں کے گھنے جنگل پر تیرگی کے ساتھ تاریکی اُلٹتی جا رہی ہے، مجھے ایک عجیب سا ہلکا سا لرزہ انگیز خیال آیا ہے کہ اگر میں اس تنبو سے دو چار قدم بھی دور چلا گیا تو ۱۵۱۴ نمبر کا یہ تنبو، بہت سے مکعب نما سیاہی مائل تنبوؤں میں کہیں کھو جائے گا۔ اور ہر تنبو میں سے ایسی ہی بھن بھن کرتی ہوئی آوازیں آئیں گی۔ اور مجھے چور سمجھ کر میرا تعاقب کرنے لگیں گی۔

یہ بہت بری بات ہے۔ میں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں، نہایت خاموشی کے ساتھ احتجاج کیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار ڈھلتی ہوئی شام اور آتی ہوئی رات کے اس سنگم پر خفگی پیدا ہوئی۔ اور میرا جی چاہا۔ تنبو ۱۵۱۴ میں

بھن بھن کرتی ہوئی آوازوں سے جا کر کہو —

"دوستو! خاموش ہو جاؤ۔ نہیں تو یہ تنبو ۱۵۸ کہیں گم ہو جائے گا۔ اور تم کہیں کے نہ رہو گے۔"

بائیں پہلو کے تنبو میں سے ایک نوجوان لڑکی تیزی کے ساتھ نکلی۔ اس کی بغل میں ایک چھوٹی سی گٹھری دبی ہوئی تھی۔ وہ تنبو سے نکل کر عقب کی طرف بھاگی۔ اور پھر اس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کے مرد کا سایہ نمودار ہوا۔ سایہ لڑکی کے پیچھے بے تحاشا لپکا۔ تنبو کی تنی ہوئی رسی میں الجھ کر منہ کے بل گرا۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر ابھرا۔ اور دوسرے لمحہ لڑکی کو جونڈے سے جا پکڑا اور زمین پر گھسیٹتا ہوا واپس کھینچنے لگا۔

"حرامزادی! لنگوٹی کہیں کی۔ ہڈیاں توڑ دوں گا تیری۔ قدم نکال کے تو دیکھ؟"

لڑکی کا بدن کھردری زمین پر شاید چھل رہا تھا اس لئے وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور پیچھے جا رہی تھی۔

"چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے۔ نامراد! کمینے، چھوڑ دے مجھے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ نہیں رہوں گی۔"

"زیادہ بڑبڑ کی تو زبان کھینچ لوں گا گدی سے۔ ڈائن۔ میرے بھائی کو تو راستہ میں کھا گئی۔ اور اب۔۔۔۔"

"مار ڈالو۔ مار ڈالو مجھے۔ مگر میں بھی سادھو رام کی بیٹی ہوں۔ جو تم سے بیاہ کر جاؤں۔ نہیں رہوں گی۔ نہیں رہوں گی تمہارے پاس بڈھے کھوسٹ! — چھوڑ دو مجھے —"

"ہوں! نہیں رہے گی۔ اور یہ گٹھڑی اپنے باپ حرامزادے کے پاس لے جائے گی۔ ہیں نا؟ جیسے جہیز ہی میں تو لائی تھی۔ کتی! —"

مرد نے لڑکی کے جونڈے کو ایک زور کا جھٹکا دیا۔ لڑکی قریب قریب چیخ پڑی۔ اور اپنی بغل کی پوٹلی ہوا میں اچھال کر مرد کے منہ پر دے ماری۔ گیہوں کا ایک چھینٹا سا ہوا۔ مرد جونڈا چھوڑ کر پوٹلی کی طرف جھپٹا۔ لڑکی موقع پا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر الٹے پاؤں تیزی سے بھاگی اور تنبو کے عقب میں سے ہوتی ہوئی بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کسی پگھلی ہوئی چیز کی طرح ڈھلتی چلی گئی۔

مرد پوٹلی اٹھا کر قدرے بھن بھنایا اور پھر ہاتھ جھٹک کر تنبو میں گھس گیا۔ چھوٹا سا ہنگامہ ہوا اور فرد ہوگیا۔ چھوٹی سی زندگی دوڑی اور مرگئی اور پھر رہی نیم جان سی۔ میٹ میلی سی بھن بھناہٹ جاگ پڑی۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" — تنبو ۱۵۸ میں سے ماسٹر دیا لو رام اپنی گنجی کھوپڑی کو کھجلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اور پھر اس کے پیچھے لنگڑاتا ہوا بابا بھگت رام اور ایک اور چہرہ، ایک اور — اور پھر آوازیں —

"کیا ہوا؟ کیا ہوگیا؟ کون تھا؟؟"

"لڑکی — ادھر ایک لڑکی بھاگ گئی" میں نے دھندلے خلاء کی طرف بڑی دلجمعی کے ساتھ اشارہ کیا۔

"ہی ہی ہی۔ گئی گئی —"

"وہی ہوگی۔ وہی نکھٹو بھاگ گئی نا؟ ہی ہی ہی۔ حرامی تھی۔ کیسے رہ سکتی تھی۔ گئی گئی گئی۔"

"ہائے نی ہائے —" ایک بوڑھی سی زنانہ آواز منمنائی۔

"ارے؟ وہی سوہنے کی بہو؟ ہائے نی ہائے۔ کل تو اس کے بیاہ کی بات چل رہی تھی۔"

"کس سے؟"

"سوہنے کے بھائی جیمنی سے"

"اس بڈھے سے؟ . . . . کھی کھی . . . ."

"ہی ہی ہی۔ کیا بڑا تھا؟"

"بوڑھی گھوڑی۔ لال لگام!"

"کھی کھی کھی — . . . ہی ہی ہی"

سکھیاں پھر تنبو کے اندر چلی گئیں۔ کچھ لذت، کچھ رشک، کچھ افسوس۔ اور پھر چھپے ہوئے ہراس کی مبہم سی لہر نے سر اٹھایا۔

"کیسا زمانہ آیا ہے؟ — نہ جانے کیا ہوگا؟ — لاج دھرم کا تو بھگوان ہی نگہبان ہے —"

لہر بھاگ گئی۔ اور اپنے پیچھے ہراس کی لکیریں چھوڑ گئی۔ لکیریں۔ جن میں اشارے تھے خدشے تھے اور سندیسے۔ صاف صاف، کھلے کھلے — مگر تنبو ۱۵۴ کے باسی تو ہر کھلی چیز سے ڈرتے تھے۔ بلی کی طرح دبک جاتے تھے۔ ذرا سا تحرک، ہلکی سی ہلچل بھی ان کے زخموں کو جگا دیتی تھی، انھیں تو دھندلاہٹ پسند تھی، انھیں تو ابہام پسند تھا، انھیں تو بے رنگی پسند تھی۔

وہ پھر اپنے اپنے کمبلوں اور چادروں میں سکڑ گئے۔ نگاہیں پھر اپنی چیزوں، اپنی گٹھڑیوں اپنے برتنوں کو ٹٹولنے لگیں — "بیٹھو! بیٹھو، بیٹھ جاؤ، مت اٹھو، مت چلو، مت بولو، نہیں تو کوئی نہ کوئی چیز گم ہو جائے گی، کوئی نہ کوئی چیز لٹ جائے گی۔ کوئی نہ کوئی چیز بھاگ جائے گی —!!"

میں تنبو ۱۵۴ کے باہر کھڑا ہوں۔ سیاہی اب پوری طرح گر چکی ہے، ہاتھوں پر، پیشانی پر، کپڑوں پر اندھیرے کی تہیں جم گئی ہیں، کہیں کہیں موم بتیاں جاگ پڑی ہیں، لیکن زیادہ تر تنبو تاریکی میں لپٹے ہوئے اونگھ رہے ہیں۔ کیمپ کا لاؤڈ اسپیکر زور زور سے چیخ رہا ہے —

"راشن دفتر میں غلط نام لکھانے والے کو پچاس روپیہ جرمانہ ہوگا"

"ایک تنبو میں دس کنبوں سے کم نہیں بسنے چاہئیں"

"اپنے اپنے تنبو کا نمبر یاد رکھو۔ ورنہ . . . . ."

"لکڑی نہیں ملے گی، دال ملے گی، نمک نہیں ملیگا، مرچ ملے گی۔"

"جو آدمی زیادہ راشن لے گا۔ اُسے ایک ہفتہ تک راشن نہیں ملے گا۔"

جی ٹی روڈ کی طرف سے بستر گٹھڑیاں اور ٹرنک اٹھائے ہوئے بے شمار ننھی چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے کیمپ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکراتی ہیں اور کسی بوسیدہ لکڑی کی طرح درمیان ہی سے ٹوٹ جاتی ہیں اور دماغوں میں صرف ایک ہراس انگیز تھرتھری چھوڑ جاتی ہیں۔

"کچھ ہونے والا ہے! کچھ ہونے والا ہے"

انھیں اپنے اردگرد زنجیریں لپکتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں، ان کے پاؤں بار بار لڑکھڑا جاتے ہیں۔ لیکن وہ پاؤں پر دباؤ ڈال کر دانت بھینچ کر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر بھاگتے ہیں وہ پکارنے لگتے ہیں۔

"اری سشیلو کی ماں! وہ پیلا ٹرنک سنبھال کر رکھنا"

"دوڑ کے آ بے شاماں! ٹانگیں تو نہیں ٹوٹ گئیں تیری؟"

"وہ کہاں رہ گئی لڑکی، کمبخت کی انگلی پکڑ کے لے"

تنبوؤں کے اندر موت کی سی ہلکی ہلکی سسکیاں بھرتی ہوئی فاقہ مستی ہے اور تنبوؤں کے باہر ایک اضطراب ہے ـــــ رات کیسے کٹے گی؟ صبح کیسے ہوگی؟ روٹی کہاں ملے گی؟ تنبو کب ملے گا؟ یہ لاؤڈ اسپیکر کیوں چپ نہیں ہو جاتا، یہ اتنے سارے تنبو کیوں ہیں؟ ـــــ جلدی کرو۔ تیز تیز چلو۔ نہیں تو ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ گے، ایک دوسرے کی چیزیں اٹھا لو گے۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاؤ گے ـــــ۔

تنبو کے باہر اب کچھ سجھائی نہیں دیتا، اس لئے میں تنبو کے اندر چلا گیا ہوں ـــــ تنبو میں صرف دو موم بتیاں جل رہی ہیں۔ ایک بتی دوسری کونے میں حکیم گنگا رام کے بیٹے رگھو رام نے جلا رکھی ہے اور وہ اس کی پیلی روشنی میں اپنی نو بیاہتا بیوی رام پیاری کے گول مول چہرے کی طرف برابر تکے جا رہا ہے اور اس کی بغل میں دھنسا ہوا، ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں اس سے محبت کر رہا ہے۔

دوسری بتی شاید رام لبھایا سابقہ کلرک میونسپل کمیٹی کی ہے وہ اپنی بیوی سے بڑی مردانہ دھمکی کے سے انداز میں کہہ رہا ہے۔

"اری گدھی! تمہیں کئی بار کہا ہے، اب یہ بتی بجھا دو۔ خواہ مخواہ کا نقصان کیوں کر رہی ہو؟"

رام لبھایا کلرک کی بیوی نو بیاہتا نہیں ہے۔ اس کا چہرہ موم بتی کی روشنی میں رام لبھایا کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس نے ایک بار رام پیاری کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر ہاتھ مار کر بتی بجھا دی۔ اور خود تاریکی میں ڈوب گئی۔ اور رگھو رام کی بتی پوری طاقت سے تنبو میں جگمگا اٹھی۔

موم بتی کی زردہ اُداس اور تھکی ہوئی روشنی سبھی چہروں کو بے حس بنا رہی ہے۔ فرش پر اُگی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھاس، اور ریت کے ذرّے اور یہ نیم مردہ روشنی اور دق زدہ سے چہرے، اور بھن بھن کرتی ہوئی ٹوٹتی آوازیں اور پھیلی ہوئی۔ گھٹی گھٹی سی سیلی سیلی بساند ـــــ سارا ماحول یوں لگتا ہے جیسے کوئی بدہضمی کا مریض لیٹا ہے۔ گھناؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔

مغربی کونے کی قطار میں، آخری گوشے سے بار بار ایک کربناک سی دبی دبی آواز آ رہی ہے:۔

"اوئے مر گیا ری میا! کوئی بچاؤ رے مجھے" اور پھر ایک تلملاتی ہوئی، مگر نحیف و نزار بوڑھی آواز ابھرتی ہے جس میں گرم گرم آنسوؤں کی ٹپ ٹپ ایسا آہنگ ہے۔

"بھگوان تیری راکھی کرے گا۔ بیٹا۔ تمارو بیٹے! اسی بنسری۔ اسی کے ہاتھ میں لاج ہے اپنی ـــــ،

"تمارو کی ماں! ـــــ" ایک اکتائی ہوئی آواز اسی کونے ہی سے اٹھی۔ یہ ماسٹر دیا رام کی آواز تھی ـــــ "اسے سونف کا عرق پلاؤ کہیں سے لا کر۔ ورنہ یہ ہیضے کا کیس ہے ہیضے کا۔ اگر بگڑ گیا تو سنبھالے نہیں سنبھلے گا" اور پھر ایک گہری ٹھنڈی سانس بھر کر ماسٹر دیا رام نے جیسے خطرہ کو شدید کر دیا۔

ہیضے کا لفظ کڑوے کسیلے گھونٹ کی طرح ہر ایک کے حلق سے ٹکرایا، ہر ایک جسم نے ایک جھرجھری سی لی، اور پھر چودھری بھجن رام کمبل ہی میں منہ کھولے، اندر ہی اندر پکارا۔

"میں کہتا ہوں۔ سائیں میرا لڑکے کو ہیضہ تھا، تو اس بڈھیا سے پوچھو، اسے تنبو میں لائی کیوں؟ سائیں میرا اب اگر صبح بات منہ سے نکالیں تو کاٹنے کو دوڑے گی یہ عورت!"

جانکی رام جس کی رگوں میں جوان جوان خون تھا اور اس خون میں شاید ابھی مروت کی رمق باقی تھی،

اجنبی لہجہ میں بول اٹھا۔

"چاچا! آدمی بات کرے۔ مگر زہر تو نہ گھولے۔ تمہارا اپنا لڑکا ہوتا، تو کیا یوں روکھی بات کرتے، اتنا تو سوچ لے۔ پہلیں کا معاملہ ہے۔ لڑکے کا باپ یہاں ہے نہیں، تو بچاری بڑھیا کے پاس چھلا تک انگلی میں نہیں رہا، کہاں پھینک آئے لڑکے کو؟"

چودہری بھجن رام کے منہ سے ایک خفت آمیز سی ہلکی۔ ہڑبڑاہٹ ابھری۔ جو تھارو کی ماں کی سسکیوں میں ڈوب گئی۔ جھانگی رام کا خلوص اور بھی کس گیا۔

"میں کہتا ہوں، سب اپنی اپنی چنتا کرو۔ بھگوان ہی جانتا ہے آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہ بیچنے کی حالت نہیں ہے۔"

رام لبھایا کلرک نے تاریکی میں سے اپنی سوکھی ہوئی گردن اور لمبے لمبے دانت نکالے اور دکھی لہجہ میں کہنے لگا

"بات پتے کی کہہ رہا ہے لڑکا، اسی چاچا بھجن رام سے پوچھو، کل اس سے روپیہ مانگا۔ تو کورا جواب دیدیا۔ چاچا! آخر دو سیر گھی کے روپے تو واجب تھے تم پر۔ کوئی خیرات تو نہیں مانگ رہا تھا تم سے۔ میں کہتا ہوں، جب اپنے ساتھ سمبندھی اس بے ایمانی پر اتر آئیں تو کوئی کس کا گلہ کرے۔"

تھارو متواتر کراہ رہا تھا۔ "مر گیا ری امڑی!"

بھجن رام کمبل منہ سے ہٹا کر یکدم ابھرا۔ رام لبھایا کی سیدھی چوٹ نے اسے تلملا دیا تھا۔

"ادے سائیں میرے کو . . . . رام لبھایا! تو کس منہ سے میرے سامنے بولتا ہے رے! کمینہ کے ساتھ جتنی بھلائی کرو۔ پر اپنی کم ذاتی تو نہیں چھوڑتا، سائیں میرا!!! تیرے ہونٹوں میں تو ابھی تک میرا لہو لگا ہوا ہے بھول گیا وہ اپنے بھائی کے بیاہ والا فضیحتہ لالہ جی کی ناک کٹ جاتی برادری میں۔ جب پتہ چلتا وہ تو کہو میں نے لاج رکھ لی۔ ورنہ . . . . . ."

رام لبھایا کلرک کے بجائے جھانگی رام نے جواب دینا چاہا۔ مگر جھانگی رام کی بیوہ ماں سیتاں نے اپنے بیٹے کو جھاڑ کر چپ کرا دیا۔

"نکھو کہیں کے۔ تو کیوں بیچ میں بولتا ہے۔ تجھے کیا پڑی ہے۔ چاچا جانے یا بھتیجا جانے۔ ہمیں کیا!"

جھانگی رام کی ماں کو صبح چودہری بھجن رام نے حتمی وعدہ دیا تھا کہ وہ جھانگی رام کا بیاہ ٹھاکری کی بڑی لڑکی مولو کے ساتھ انہی دنوں میں کرا دیگا۔ مولو کے سوتیلے باپ کو وہ دو سو روپے پر راضی کر چکا ہے۔ جھانگی رام کی ماں اسی بہو کے لئے کتنی ہی منتیں مان چکی تھی اپنے گاؤں کے شاہ عزیز کے مزار پر کئی چڑھاوے چڑھا چکی تھی، گوردوارہ میں ہر دوسرے تیسرے متھا ٹیکنے جایا کرتی تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مولو کے سوتیلے باپ کا دل نہیں پسیجا تھا، برادری میں عام چرچا تھا کہ وہ مولو کو کم از کم تین سو روپے میں بیچنا چاہتا تھا، چاہے وہ جھانگی کی ماں دیدے، چاہے کوئی بھنگی کا بیٹا دیدے۔

اور آج صبح جبکہ بابا بھجن رام نے دو سو روپے پر بات پکی کر لی تھی، جھانگی کی ماں نے دل ہی دل میں اپنے زیوروں کی قیمت لگا کر انھیں بیچ دینے اور چاند الیسی بہو سے گھر بسانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ چاچا بھجن رام کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی، چہ جائیکہ چاچا بھجن رام ان دو سو روپوں میں سے اپنی رشوت کے پچاس روپے ضرور رکھ لے گا۔ لیکن . . . . . .

لیکن اسے چاچا بھجن رام کی رشوت سے زیادہ یہ مبہم سا خطرہ کھائے جاتا تھا کہ تھارو کا یہ بار بار اس عذاب انگیز

طریقہ پر کراہتے چلا جاتا کہ کسی بدشگونی کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ تھاوسکی ہائے ہائے اسے ڈنک کی طرح چبھی جا رہی تھی۔

مگر رام لبھایا کلرک نے جانکی کی ماں کو آڑے ہاتھوں لے لیا ـــ

"ماسی! اچھا چاہو تو تم آس لگائے بیٹھی ہو۔ وہ میں سب جانتا ہوں۔ یہ کام اس سے کبھی نہیں ہونے کا۔ اور میں تو کہتا ہوں ماسی! تیرا لڑکا تو بالکل بڑھو ہے بدھو۔ جب ٹھاکری کل اپنے منہ سے کہہ رہی تھی کہ جانکی کی جگہ میں ہوتی تو میری ہو کو جھونٹے سے پکڑ کر کہیں لے جاتا۔ وہ اپنے دھرم سے نہیں پھرنے کا۔ مگر ہاں لڑکے میں بھی تو کچھ ہوتا ہوــ"

جانکی رام کی ماں اپنے جوان بیٹے کی یہ توہین برداشت نہ کر سکی غرّا کر بولی ـــ

"منہ سنبھال کر بات کر بے لبھو! آنٹ شنٹ بک رہا ہوں، اگر دھرم نہیں گنوایا ہے اپنا۔ میرا جانکی کوئی اچکے کا بیٹا نہیں ہے کہ یوں سرپنچوں کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ ڈالتا پھرے گا۔ بھگوان چاہے گا تو اجنت داروں کی طرح آٹھا بٹھاؤں گی اور اپنی بہو کو ڈھول ڈھمکے کے ساتھ اپنے گھر لاؤں گی۔"

"اپنے گھر لائے گی؟ قہ قہ قہ قہ ـــ" ماسٹر دیا رام کے منہ سے بے اختیار طنزیہ قہقہہ پھوٹ پڑا۔ رانی سمجھتی ہے کہ اس کا اپنا گھر بھی کوئی رہ گیا ہے اب؟ قہ قہ قہ قہ . . . ."

قہقہہ کی کڑواہٹ اور تھاوسکی ہینہ میں لتھڑی ہوئی کربناک کراہ نے تنبو کی فضا میں ایک عجیب ڈوبی ڈوبی سی کیفیت پیدا کر دی۔

اور تنبو کے باہر سرد اور برفیلی ہوا میں جھونپو کی آواز بدستور اسی طرح کپکپا رہی تھی جیسے کسی مسلسل خطرے کا اعلان کر رہی ہو۔ رفیوجیوں کے ٹرک ست یدا ابھی تک سرحد سے بھاگ آئے تھے اور بڑی سڑک کی طرف سے بے ہنگم اور غیر متوازن شور کی لہریں برابر آ کر ہمارے تنبو سے ٹکرا رہی تھیں۔ یہ کبھی مدھم پڑ جاتیں اور کبھی یک دم تیز ہو جاتیں۔ اس شور میں اب ہمارے لئے کوئی نیا پن نہیں رہا تھا۔ کسی حیرت اور جستجو کا حسن نہیں رہا تھا۔ کوئی آنکھ اب اس شور کی طرف نہیں اٹھ سکتی تھی۔ کوئی کان ـــ اس کے لئے نہیں جھپک رہی تھی۔ کوئی دل اس کے لئے نہیں دھڑک رہا تھا ـــ یہ شور وہی بھوسلے رنگ کا، سوکھی مٹی ایسی بو لئے ہوئے تھا جو گذشتہ دو ماہ سے یہ شرنارتھی سنتے اور سونگھتے چلے آئے تھے۔ البتہ اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ جوں جوں نئے شرنارتھیوں کے آنے کی آوازیں آتی جاتیں، توں توں تنبو ۱۵۴ کے رفیوجیوں کی الجھن بڑھتی جاتی اور ان کا یقین پختہ ہوتا جاتا۔ اور انھیں یوں لگتا جیسے آنے والے رفیوجی اس تنبو کو اکھاڑ کر سر پر اٹھائے ہوئے کہیں لے جائیں گے اور یہ خود پوس مہینے کے اس جان لیوا جاڑے میں، کھلے آسمان کے نیچے ٹھٹھر ٹھٹھر کر دم توڑ دیں گے۔

تنبو ۱۵۴ کے یہ شرنارتھی ایک ہی برادری کے افراد تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی رشتہ میں گندھے ہوئے تھے۔ ایکتا کے اسی نیم مردہ سے باسی احساس نے انھیں اس تنبو میں لا اکٹھا کیا تھا۔ اس ایکتا میں ان کی تمناؤں کا عکس نہیں تھا۔ ان کی تمنائیں تو اپنے خدوخال کو کسی نہ کسی طرح ڈھانپے رکھنا چاہتی تھیں۔ یا یوں کہنے کہ ہر فرد کی اپنی تمنا ہی ان کے لئے ہراس تھی، ان کی تمناؤں کو سوائے اپنے آپ کے کسی اور سے توقع نہ تھی، فسادوں کے ہنگامے، خطرناک سفر کی صعوبت اور موجودہ بے سروسامانی نے اس نیم مردہ باسی اور گھسے پٹے برادرانہ شیرازے کو جس پر گاؤں کی زندگی نے پردہ ڈال رکھا تھا اب اس تنبو میں بڑی بے شرمی کے ساتھ بکھیر دیا تھا۔

اور اب ان سب لوگوں کی تمنائیں ننگی تھیں ہر آدمی اپنا چہرہ ننگا کر کے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سینے سے اتار چکا تھا چودھری بھجن رام کو اس بات پر کوئی شرم نہیں آتی تھی کہ وہ ایک لڑکی کو دو سو روپوں میں بیچنے کی کھلے عام بات چلا گئے۔ رگھو رام اپنی نئی بیاہتا بیوی کے حسن سے بھری برادری میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ماسٹر دیا رام تھاور کو سونف کا عرق لا کر نہیں دیکتا تھا بلکہ صرف مشورہ دیکر سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ تھاور کی ماں بھاگ بھری کی زبان پہ ہر وقت یہ فقرہ رکھا رہتا تھا۔ کہ بھجن چودھری! اسی تھاور کے لئے تو ہی تو اپنی بیٹی تک دینے کا مجھ سے وعدہ کیا کرتا تھا اب تیرے دیدوں کا پانی کہاں مر گیا ہے کہ تھاور کا تنبو میں رہنا بھی تجھے دو بھر معلوم ہو رہا ہے۔

بھاگ بھری تھاور کے سر کو اپنی گود میں رکھے، دم روک کر بیٹھی تھی۔ تھاور کراہ رہا تھا، تھاور کھانس رہا تھا۔ تھاور تڑپ رہا تھا، تھاور بلک رہا تھا۔ اور تھاور کی ماں کے پاس سونف کا عرق نہیں تھا اور اس کی بجائے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ فراٹے بھر کر آتا ہوا ٹرک بار بار گھوم جاتا تھا جس میں چڑھ کر اس کا شوہر پنڈت داتا رام اور دونوں لڑکے سدھیر پنڈت اور مولا رام آتے ہوئے بھن گئے —

"آج اگر تھاور کا باپو یہاں ہوتا۔ تو میرے بیٹے کی یہ حالت تو نہ ہوتی —" تھاور کی ماں نے بڑبڑا کر ساری برادری والوں کو سنانے کے لئے کہا۔

اور یہ فقرہ برادری کے ایک ایک آدمی کے کان سے گذرتا ہوا دوسرے آدمی تک چلا گیا اور ہر آدمی کان لپیٹے خاموش رہا۔ اب بڑھیا کے ساتھ کون بحث کرتا پھرے۔ جو بھرے بازار میں مردوں کے لتے لے ڈالتی تھی۔

ماسٹر دیا رام نے گہرا ٹھنڈا سانس بھر کر کہا "ماسی! سچ پوچھتی ہو۔ تو کہوں گا کہ اگر پنڈت داتا رام بھی یہاں ہوتے تو ان کی بھی یہاں کوئی نہ سن پاتا۔ دیکھتی نہیں، کیسی آپا دھاپی مچی ہوئی ہے —؟"

بھاگ بھری نے چپکے سے ایک آنسو گرایا — "وہ میرے بھاگ پھوٹے جو میں گاؤں چلی گئی۔ نہیں تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا"

ماسٹر دیا رام نے دلاسا دیا۔ "ماسی! پرماتما کا نام لو۔ گھبراتی کیوں ہو، صبح ہوتے ہی میں کسی حکیم کے پاس جاؤں گا۔ پنڈت داتا رام کا لڑکا کوئی غیر تھوڑا ہے؟"

ماسٹر دیا رام ہمیشہ پنڈت داتا رام کو عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا اسے اس بات پر بڑا فخر رہتا تھا۔ کہ ہمارے ہی گاؤں کا پنڈت داتا رام آزادی حاصل کرنے کے لئے جیل کاٹتا رہا ہے۔

تنبو کے سبھی افراد آہستہ آہستہ اونگھنے لگے اور کئی ایک خراٹے بھی لینے لگے تھے۔ رگھو رام اور اسکی بیوی الگ الگ کمبلوں میں مگر ایک دوسرے کے ساتھ لیٹ کر سو گئے تھے۔ سونے سے پہلے رگھو رام نے اپنی موم بتی تھاور کے سرہانے لا کر رکھ دی تھی۔ آخر تھاور اس کا بچپن کا یار تھا اور دونوں مل کر گاؤں کی میلا لڑکیوں کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ ماسٹر دیا رام غنودہ حالت میں بھی تھاور کی ماں سے باتیں کر کے اس کا جی بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ بھاگ بھری کی بائیں ران جس پر اس نے تھاور کے سر کو سہارا دے رکھا تھا بے حد تھک چکی تھی، مگر وہ خاموشی سے ٹھنڈی آہیں بھر کر ٹپ ٹپ آنسو گرا رہی تھی۔ موم بتی اس نے سرہانے سے ہٹا کر پہلو میں رکھ دی — "یہ رگھو تو بالکل پاگل ہے پاگل۔ بھلا زندہ آدمی کے سرہانے بھی کوئی بتی جلاتا ہے — کتنا برا شگون ہے —" موم بتی ہٹاتے وقت اس کے ہاتھ خواہ مخواہ کپکپا اٹھے۔

بڑی ڈراؤنی اور یاس انگیز خاموشی تنبو میں گھوم رہی تھی تنبو کے باہر بھی اب آواز میں کچھ غنودگی سی

ہو گئی تھی۔ اسی خاموشی کو کبھی کبھی چاچا بھجن رام کی گہری ٹھنڈی سانس ایسی آواز توڑ دیتی ہے "او میرے مالکا! تو ہی سچا سائیں ہے"

تھاور کی کراہیں بھی اب جیسے اس کے سینے کے اندر ہی بل کھا رہی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے ایک وحشتناک سی ہچکی نکل جاتی جیسے کوئی اٹکی ہوئی چیز کو پیچھے سے دھکیل کر آگے بڑھا رہا ہو۔

تھاور ـــــ! میں چپ چاپ ایک کونے میں لیٹا ہوا اس کے بارے میں سوچنے لگا ـــــ پنڈت داتا رام کا یہ لمبا تڑنگا لڑکا جس کے بارے میں گاؤں والے کہا کرتے تھے کہ اس نے کہیں سے کوے کا مغز کھا لیا ہے اور بولتے بولتے ہانپتا نہیں تھا۔ اب سوائے اس مرگ آلود ہچکی کے اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا ـــــ ایک بار جب پنڈت داتا رام نے ایک لیڈر کی تقریر سن کر سی۔ آئی۔ ڈی کی ملازمت پر لات مار دی تھی اور گرفتار کر لیا گیا تھا۔ تو بھاگ بھری اپنے بچے کو لے کر شہر چلی گئی تھی۔ اس وقت تھاور کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہی ہوگی ـــــ اور چار سال بعد جب تھاور دولھا بن کر گاؤں آیا تھا تو اس کے پاس بہت سی کتابیں بھی تھیں اور گاؤں والوں کو یہ بتا کر کہ وہ یہ سبھی کتابیں پڑھ سکتا ہے اس نے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بیاہ پر جو سہرا پڑھا گیا تھا پنڈت داتا رام نے بتایا تھا کہ یہ تھاور کا اپنا لکھا ہوا ہے اور سہرا سن کر تھاور کے سسرال والے نے براتیوں کو پاؤ پاؤ بھر دودھ پلا دینے کا فیصلہ کر دیا تھا، اور تھاور کی دلہن ہرنامی نے سہرے میں اپنا نام سن کر شرم بھرے غرور کے ساتھ گھونگھٹ اور بھی نیچے اتار لیا تھا۔

اور جب فساد ہوئے اور قافلے چلے تو اس وقت تھاور اپنے سسر کے گھر میں بخار میں تپ رہا تھا گاؤں پر حملہ ہونے سے ایک دن پہلے بھاگ بھری اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے گاؤں آگئی۔ لیکن دوسرے دن حملے میں اس کی بہو ہرنامی کو تو غنڈے اٹھا کر لے گئے، باقی گھر والوں کو قتل کر دیا گیا اور بڑی مشکلوں سے بھاگ بھری اپنے بیمار بیٹے تھاور کو کیمپ تک لے جانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

کل جب ماسٹر دیا رام نے تھاور کو ٹرک سے اتارا تھا تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ ٹرک سے اترتے وقت اس سے ایک منٹ تک کے لئے کھڑا نہ رہا جا سکا اور وہ فوراً زمین پر بیٹھ گیا اور پھر وہیں لیٹ گیا اور یہ دیکھ کر چاچا بھجن رام نے گرج کر کہا تھا۔

"دو سائیں میرے کو۔ بڑھیا لاشوں کو بھی ساتھ اٹھائے پھرتی ہے اور یہاں بھلے چنگے انسانوں کو ٹرک میں جگہ نہیں ملتی۔" اور اب اسی شام کو نیم جاں تھاور موت وحیات کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

بھجن رام کے خراٹے اب میرے حلق میں جیسے خراشیں ڈالنے لگے۔ میں نے بھاگ بھری سے کہا۔

"چاچی! اب تھوڑا آرام کر لو اور سو جاؤ۔ بھگوان نے چاہا تو تمہارا تھاور ٹھیک ہو جائے گا، شاید کل تک پنڈت جی بھی یہاں پہنچ جائیں۔"

"ہائے بیٹا! میری آنکھ کہاں لگتی ہے نگوڑی، تم ذرا اٹھ کر دیکھو تو سہی۔ تھاور کی طبیعت اب کیسی ہے۔ مجھے تو کچھ . . . . . ." اور پھر بھاگ بھری کا گلا رندھ گیا۔ اس سے آگے جو الفاظ وہ کہنا چاہتی تھی، وہ میرے دماغ میں بھوتوں کی طرح ناچنے لگے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور تھاور کے قریب جا بیٹھا۔

تھاور کا سانس اکھڑ رہا تھا، اس کی چھاتی خالی ڈھول کی طرح کھڑ کھڑا رہی تھی آنکھیں جیسے مجبوراً نیم وا ہو رہی تھیں اور پھر کبھی کبھی وہی اکھڑی اٹکتی ہوئی کربناک ہچکی ـــ

"اگر کوئی ڈاکٹر اس وقت مل جاتا" میں نے روکنے کے باوجود اپنی حسرتناک خواہش کا اظہار کر دیا، حالانکہ

مجھے یقین تھا کہ شرنارتھیوں کے اس تمبو تک اس وقت کوئی ڈاکٹر پچاس روپے سے کم میں آنے پر تیار نہیں ہوگا۔

تھاور کی ماں اور میں نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے دو قیدی ایک دوسرے کی زنجیروں کی طرف دیکھ کر کسمسا اٹھیں، تھاور کی بڑھتی ہوئی ہچکیوں میں اب ایک چرچراتی ہوئی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس آواز نے مجھے بہت سہما دیا تھا۔

اتنے میں چاچا بھجن رام والے کونے کی طرف سے ہلکی ہلکی سرگوشی کی صدا ابھری۔ پھر یہ سرگوشی تیز ہو گئی۔ پھر صاف ہو گئی، یہ چاچا بھجن رام اور اس کی بیوی کی آوازیں تھیں۔ ان باتوں میں وہی جانی پہچانی کڑواہٹ تھی۔ اور پھر نہ جانے کیا ہوا! چاچا بھجن رام یکدم اُبل کر اٹھ بیٹھا اور بڑی تلخ سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔

”میں نے کہا تھاور کی ماں! سائیں میرے کو۔ تمہیں تھاور کو اس تنبو میں سے ابھی ابھی باہر لے جانا ہوگا۔ بھلمنسائی کی حد بھی ہوتی ہے کوئی ___ سائیں میرا ___“

اور اس کے ساتھ ہی دوسری آواز ۔ بھجن رام کی کھوسٹ بیوی لالانی اپنے کمبل کے اندر سے منمنائی۔

”کوئی انجان ہو تو سمجھائے بھی۔ تھاور کی ماں کیا نہیں جانتی کہ میری بہو اپنے دنوں سے ہے بھگوان نے اس کے گھر بھی تو پھل دیئے تھے کیا وہ خود ایسا کرنے دیتی کسی کو . . . . .“

بھاگ بھری ان دونوں سنکی اور تند مزاج میاں بیوی کا مقصد بھانپ گئی۔ بھجن رام کی بہو کے بچہ ہونے والا ہے۔ تو کیا اس کی خاطر میں اپنے تھاور کو جنگل میں پھینک آؤں، اسے اپنا پھل پیارا ہے۔ تو میرا پھل بھی زہر نہیں ___ شیرنی کی طرح گرج کر بولی:۔

”چودھری! کیسی باتیں کرتا ہے۔ بھگوان تیری بہو کی گود بھرے۔ میری آنکھ میلی نہیں ہوگی، مگر یہ مت بھولو کہ میں اپنے تھاور کے بارے میں یہ بدشگونی نہیں سننے کی۔ زبان سنبھال کر بات کیا کرو۔“

”ہائے نی ہائے! بھجن رام کی بیوی پھر منمنائی ___ ”ماری! تیرا شگون تو جب ٹھیک ہوگا، جب اس تنبو سے دو لاشیں نکلیں گی، نہ بھائی نا؟ چاہے کسی کو برا لگے یا اچھا لگے۔ میں تو صاف کہے دیتی ہوں، چھوٹے کے باپ سے کہ دیکھ بھال کے ہم مکھی نہیں نگلیں گے۔“

تھاور نے ایک طویل سی ہچکی لی، میں اور بھاگ بھری دونوں ایک ساتھ جھپٹے۔ سانس ابھی تک آرہا تھا۔

لالانی دیوی نے پاس پڑی ہوئی بہو کو زور سے ٹھوکا دیا ”اٹھ ری دھرم دئی۔ اٹھ بیٹی! یہاں تو یہ ڈائن تیرے پھل کو کھا کر دم لے گی۔ بچانا میرے مرلی والے! مجھے ہنستے کھیلتے پوتے کا منہ دکھانا۔“

اور پھر بھجن رام بھی تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور چلا کر اپنی بیوی سے کہنے لگا ___ ”سائیں میرا ___ بھرماہ ہو ہے اسے کہاں لے جائے گی اس جاڑے میں۔ کون بیٹھا ہے باہر تیرا سمبندھی جو تیرے لئے محل کھڑے کر دیگا پڑی رہو یہاں چپ چاپ صبح کوئی بندوبست کریں گے۔“

مگر لالانی دیوی سے زیادہ اس کی بہو دھرم دئی تلملا رہی تھی وہ گھونگھٹ کاڑھے جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ ایک شور سا مچ گیا۔ تنبو کے سبھی افراد جاگ پڑے۔ خاموشی اور اداسی کی فضا میں یکدم طوفان سا آ گیا۔ ماسٹر دیا رام جل کر کہنے لگا۔

”تم لوگ بالکل چوہڑ ہے ہو چوہڑے۔“

رام لبھایا کلرک کی آواز میں جوش تھا ___ ”میں کہتا ہوں۔ پنڈت داتا رام کا لڑکا چمار تو نہیں ہے

کرا رہے۔ دھکا دیا جا رہا ہے۔ اور بھجن رام ان سبھوں کی باتیں سن سن کر زور سے چیخ پڑا،

"دھکا تو ہمیں دیا جا رہا ہے۔ میں نے کئی بار کہا تھا اس بڑھیا سے۔ اپنے لئے کوئی اور تمبو ڈھونڈھ لو۔ یا اپنے کسی کانگریسی دانگریسی کو جا پکڑو۔ لیکن نہیں مانی تو اب ہم ہی جاتے ہیں یہاں سے۔ سائیں میرا — کیا کریں؟ کوئی لڑنا تھوڑی ہے۔ عورت ذات سے"

بھاگ بھری بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جاتی ہوئی بھجن رام کی بہو کا پلو پکڑ لیا۔

"بہو! تمہیں اپنے سہاگ بھاگ کی سوگند! جو یہاں سے گئی۔ اس بھرے ماہ میں مت جاؤ کہیں، میں خود ہی تھاور کو لے کر چلی جاتی ہوں۔"

ماسٹر دیا رام بھڑک اٹھا — یہ کیا ہو رہا ہے؟ تھاور کی ماں! اسے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے ہی لڑکے کا گلا گھونٹ دو۔" ماسٹر دیا رام نے تھاور کی ماں کو کلائی سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ لیکن تھاور کی ماں نے بہو کا پلو نہ چھوڑا۔ رگھو رام، تھو کر بھجن رام چاچا کو روکتا رہا، رام لبھایا کلرک لالاتی دیوی کی منتیں کرنے لگا — اور تھاور کی ہچکیاں تیز تیز ہوتی گئیں۔

ایک عجیب سا ہیجان تھا جس کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بھجن رام طیش میں آیا ہوا تھا۔ وہ کوسنے اور گالیاں دیئے جا رہا تھا۔ لالاتی دیوی منتار ہی تھی۔ بھاگ بھری کپکپا رہی تھی، رگھو، ماسٹر دیا رام اور رام لبھایا کلرک مضطربانہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔ عورتیں ناکوں پر انگلیاں رکھے دم بخود کھڑی تھیں۔ تمبو صرف ایک تھا۔ تھاور اور بھجن رام کی بہو دو انسان تھے، دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ پر اہمیت تھی۔

شدید کشمکش ابھی کچھ دیر اور جاری رہتی اگر میں اداس اور شکستہ لہجہ میں یہ اعلان نہ کر دیتا۔ کہ تھاور ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

جب میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ بھاگ بھری تڑپ کر تھاور کی طرف لپکی۔ اس کی چیخ نے ہم سب کو سر سے لے کر پاؤں تک لرزا دیا۔

اور جب بھاگ بھری تھاور کی لاش پر بے تحاشا گر رہی تھی، اس وقت بھجن رام تیزی کے ساتھ اپنی بہو اور بیوی کا ہاتھ تھامے تمبو سے باہر جا رہا تھا۔

(ناول "پنجاب کو سلام" کا ایک باب)

★

قانون تحفظ جنگل

مقرر:- آنریبل اور بہادر ریچھو — معزز اور توانا بھیڑیو!

میں نہیں چاہتا کہ اس معمولی اور عام فہم سے قانون پر آپ کا قیمتی اور گراں بہا وقت ضائع کروں کیونکہ آپ کو ابھی جا کر رشوتیں لینی ہیں۔ بلیک مارکٹنگ کرنی ہے اپنے رشتہ داروں کو عہدے دلوانے ہیں کئی سرکاری کاموں کے ٹھیکے لیکر تجوریاں بھرنی ہیں اسلئے میں کم سے کم وقت میں اس قانون پر اپنے زیادہ سے زیادہ خیالات کا اظہار کرونگا تاکہ آپ بعد میں مجھ پر عدم اعتماد کا ریزولیوشن نہ پاس کر دیں۔

فکر تونسوی

آپ کا کافی ہاؤس

محمد خالد اختر

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ " انڈیا کافی ہاؤس " کے بند ہونے کے کوئی دو ہفتے بعد سونا دریا عبدالغفور رنالڈری ورکس کی بغل میں ایک نیا کافی ہاؤس معرض وجود میں آیا تھا۔ اس کافی ہاؤس کی زندگی چراغ سحری کی طرح بہت مختصر تھی اور یہ ایک کمزور دیپے کی مانند چند یہ روز ٹمٹما کر ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ اس سارے افسوسناک واقعہ میں ایک اہم کردار تھا۔ شاید آپ اس کافی ہاؤس کی پس پردہ، اصل کہانی سننا چاہیں گے؟

جب میں ایک روز شام کو چچا عبدالباقی سے گپ شپ کی خاطر اس کے گھر پر گیا تو میں نے اسے ہمیشہ کی طرح اپنے چیک کے سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز " ایوننگ سٹینڈ " کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ اس کے چاند جیسے گول مدھ سے چہرے پر ایک قسم کا عرفانی نور پیدا ہو رہا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ اس کا موجب " ایوننگ سٹینڈ " ہے۔

" بھتیجے"، اس نے سامنے کرسی پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ بیٹھو! میں تم سے ایک ضروری معاملہ میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے سنجیدہ انداز اور اس کی آنکھوں کی عجیب روشنی سے میں فوراً جان گیا کہ یہ ضروری معاملہ اسکی روپیہ کمانے کی کسی اعلیٰ مجنونانہ سکیم کے متعلق ہوگا، اخبار کے کسی خبر کے مضمون نے اس کے تخیل کو بھڑکا دیا ہوگا اور دولت پیدا کرنے کا کوئی اور طوفانی طریقہ اس کے پر جدت اور حیران کن دماغ میں آ بسا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس کی ایسی سب سکیموں کے لئے ایک سرمایہ لگانے والے حصہ دار کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور پچھلے دو تین سال سے وہ سرمایہ دار لامحالہ میں ہوتا رہا ہوں، اس لئے مجھے اس ضروری معاملہ میں مجھ سے مشورہ کرنے کی خواہش کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ دنیا میں واحد شخص ہے جو مجھ سے کاروباری معاملہ میں یا کسی بھی معاملہ پر مشورہ لیتا ہے۔ اور قدرتاً اس سے میرے جذبۂ خود اہمیت کی تسکین ہوتی ہے۔

چچا عبدالباقی نے مجھے اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا " بھئی بھتیجا! تم نے " ایوننگ سٹینڈ " میں یہ خبر دیکھی ہے کہ انڈیا کافی ہاؤس بند ہو گیا ہے۔ مینجمنٹ نے اسے خود بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

میں نے اس خبر کو " ایوننگ سٹینڈ " میں نہیں پڑھا تھا۔ میں ٹی ایں گلہری کے اخبار کو کم ہی پڑھتا ہوں لیکن بلاشبہ میں کافی ہاؤس کے بند ہونے کے سانحہ سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس سے مجھے ذاتی دھچکا لگا تھا۔ اور فی الحقیقت میں انڈیا کافی ہاؤس میں روزانہ جانے والے اور وہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے والے انٹلیکچوئلز میں سے تھا جو اس کے بند ہو جانے سے اپنے آپ کو ایسے جانوروں کی طرح محسوس کر رہے تھے جن کا لنگر ٹوٹ رہا ہو اور جن کو اس سانحہ سے جانکاہ صدمہ پہنچا تھا۔ ان سے ان کی اماں گاہ اور ان کے ملنے کا اڈہ چھین لیا گیا تھا۔

" ہاں چچا"، میں نے دلی کرب سے جواب دیا۔ " آج ان کا آخری دن تھا۔ میں ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر ہی آ رہا ہوں۔"

"تم نے یہ بھی پڑھا ہے،" چچا نے "ایوننگ سٹینڈرڈ" کے پرچے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ٹی ایل گلہری نے اپنے غضب کے کالم میں لکھا ہے کہ حکومت نے کافی ہاؤس کو خود اپنی کارروائی سے بند کیا ہے کیونکہ لمبے بالوں والے سونڈو انٹیلیکچوئلس اور کمیونسٹ لوگ یہاں کافی کے سستا ہونے کی وجہ سے سارا سارا دن بیٹھے حکومت کے خلاف سازشیں پکاتے رہتے تھے اور لوگوں میں ہراس اور بے اطمینانی پھیلاتے تھے۔ گلہری نے کافی ہاؤس والوں پر یہ الزام بھی تھوپا ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کو کافی کے ساتھ کینیڈا ٹینٹ مہیا نہیں کرتے تھے کیونکہ ہندوستان سے کینیڈا ٹینٹ آنے بند ہو گئے تھے۔ اس کی رائے میں یہ کافی ہاؤس والے ففتھ کالمسٹ تھے۔"

"گلہری کا یہ لکھنا اس کا حد درجہ اوچھا پن ہے،" میں نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ "اب جب وہ مجھے کبھی بازار میں جاتا مل گیا تو میں اس پر عملی طور پر واضح کر دوں گا کہ میری اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ میں . . . . ."

"سو۔ تمہارا خیال ہے کہ گلہری نے جو کچھ لکھا ہے جھوٹ ہے؟"

"جھوٹ ہے۔ سراسر کمینگی۔ لمبے بالوں والے انٹیلیکچوئل! مجھے یقین ہے یہ میرے دوست جمیل پر حملہ ہے جو لمبے بال رکھتا ہے اور جو ہمیشہ کافی ہاؤس میں ملتا تھا۔ یہ گلہری کا ایک اوچھا وار ہے۔ حد درجہ کمینہ وار!"

"خیر اس کو چھوڑو،" چچا عبدالباقی نے اخبار کو کرسی پر رکھتے ہوئے اور اپنی چھوٹی ٹانگوں کو سامنے میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں! میں تم سے ایک ضروری بات پر مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی ابھی ایوننگ سٹینڈرڈ پڑھتے پڑھتے مجھے یہ خیال سوجھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالباً تمہیں روپیہ کمانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟" اپنی انوکھی بے مثال روپیہ کمانے والی ترکیبیں پیش کرنے سے پہلے چچا عبدالباقی ہمیشہ مجھ سے یہ سوال کرتا ہے میں جان گیا کہ اب کیا آنے والا ہے۔ ایک دیوانہ پن کی اسکیم، مجھے حصہ دار بننے کی پیشکش۔ ماہنامہ "الو" کے اجرا اور لوگنڈا سے وکٹوریا ؤں اور تانگوں کے لئے زیبروں کی درآمد کی اسکیموں کی حسرتناک ناکامیابی نے مجھے چچا کی اسکیموں کے متعلق محتاط بنا دیا تھا۔ میں نے اب فیصلہ کر لیا کہ اگر چچا کو صرف مشورہ کی ضرورت ہے میں اسکو بخوشی اپنا مشورہ دوں گا لیکن اگر اسے مشورے کے ساتھ سرمایہ لگانے والے حصہ دار کی بھی ضرورت ہے تو اب کے وہ سرمایہ لگانے والا حصہ دار محمد بختیار رضوی نہیں ہوگا۔

چچا عبدالباقی نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ملاتے ہوئے مجھے کچھ بزرگانہ نصیحت دی۔ "ادھر دیکھو! بختیار بھتیجے! تم ابھی بچے ہو، تم ابھی نہیں سمجھ سکتے کہ روپیہ کمانا کس قدر ضروری ہے میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم پر اس بات کا ایک بوجھ سا رہتا ہے کہ تم اپنے والد کے روپے پر جی رہے ہو میاں! نوجوان آدمی ہو۔ ہمت کرو۔ کچھ کماؤ۔ روپیہ پیدا کرو۔ روپیہ! جب میرا جیسا شخص تمہیں لاکھ روپے کے مشورے دینے کے لئے موجود ہے تو حیرت کی بات ہے کہ تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے . . . . !"

میں نے روپیہ کمانے کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

"ماہنامہ "الو" اور زیبروں کی اسکیم کی ناکامیابی سے مجھے "جج" نہ کرو" عبدالباقی نے اپنی صفائی کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں ہماری بدقسمتی سے ہمیں دوسرے لوگوں نے دھوکا دیا اور تم بھی جلد دل چھوڑ گئے، ورنہ ہماری کامیابی یقینی تھی۔ اس نئی بزنس میں ہم بالکل اپنے آپ پر بھروسہ کریں گے۔ اپنی لائنز پر اس کو چلائیں گے اچھا! پچاس فیصدی منافع میں حصہ تمہیں غالباً منظور ہوگا، نہیں تو تم پچپن بلکہ ساٹھ فیصدی حصہ لے سکتے ہو۔ صرف تمہارے کہنے کی دیر ہے،" عبدالباقی اپنے سرمایہ لگانے والے حصہ داروں کو ہمیشہ شرائط دینے میں فیاضی دکھاتا ہے۔

"اسکیم کیا ہے۔ سن تو لوں!"

"ویسے پچاس پچاس کی شرکت بالکل منصفانہ ہے اگر تم ساٹھ فیصدی منافع لو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تم زیادہ روپیہ کماؤ گے، مگر تمہارا دل خوش نہ ہوگا۔ تمہارے ضمیر میں ایک خلش سی رہے گی کہ تم اپنے حصہ دار سے منصفانہ سلوک نہیں کر رہے ہو۔ مان لیا کہ سرمایہ تمہارا ہوگا، لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ مینجمنٹ کی ذمہ داری کلیتہً میری ہوگی اور اس سرمایہ کو دوگنا اور تگنا کرنے کے پیچھے میرا دماغ کام کر رہا ہوگا پچاس پچاس کی شرکت میرے خیال میں بالکل مناسب ہے۔ . . . میں مینجنگ ڈائرکٹر ہوں گا۔ اور تم جنرل منیجر، تمہارے فرائض ہوں گے، جگہ کو ٹپ ٹاپ رکھنا، بیروں کو مختلف میزیں نامزد کرنا یہ بیرہ ان میزوں پر کام کرے گا اور یہ ان پر، کافی اور کھانڈ کے اسٹاک کو محفوظ رکھنا . . . . "

"کافی اور کھانڈ۔ تمہارا مطلب ہے کہ . . . . "

"ہاں! انڈیا کافی ہاؤس کے بند ہونے کی خبر پڑھ کر مجھے سوجھا ہے کہ یہاں اب ایک نیا کافی ہاؤس خوب کامیاب ہو سکتا ہے وہ سب انٹیلیکچوئل اور دوسرے لوگ جو انڈیا کافی ہاؤس میں جایا کرتے تھے ہمارے کافی ہاؤس کو نوازیں گے . . . . اور ہم ان کو کافی کے ساتھ کیشو نٹ بھی مہیا کریں گے — لیکن بھتیجے ہمیں جلدی کرنی ہوگی پیشتر اس کے کہ کوئی اور اس معاملے میں پہل کر ڈالے یا کافی کو زندگی کا لازمہ سمجھنے والے انٹیلیکچوئل اس کے بغیر ہی جینے کے عادی ہو جائیں"

یہ واقعی ایک معقول اور مضطرب کن تجویز تھی لوگوں کو ان کا کافی ہاؤس واپس ملنا چاہئے! چچا عبدالباقی سے اپنی پہلی شرکتوں کی تاریخ کو بھول کر میں سوچنے لگا کہ یہ کافی ہاؤس عجیب چیز ہوگا ایک شخص کافی ہاؤس میں ساری عمر خوش خوش گزار سکتا ہے۔ یہ چیز بالکل میرے مزاج کے مطابق ہوگی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قدرت نے میرے لئے اصل کیریر یہی ایک مقرر کر رکھا تھا — کافی ہاؤس کا جنرل منیجر میں اپنی نئی پوزیشن میں اپنے کو متصور کر کے گلابی خواب دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "چچا ہندوستان سے کافی درآمد کرنے میں ہمیں دقت ہوگی"

"دقت کیا ہے؟" چچا عبدالباقی کے لئے ہر ایک چیز سہل ہوتی ہے "وزیر صنعت بھی میری طرح علیگڑھ کا اولڈ بوائے ہے۔ کل "ایوننگ سٹیل" میں اس کی زندگی کے مختصر حالات سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی۔ آخر ایک پرانے علیگڑین کا اتنا بھی لحاظ نہ کرے گا کہ کافی کی درآمد کا پرمٹ دینے سے انکار کر دے۔ تم اس بات کی فکر نہ کرو، یہ سب ترددات عبدالباقی پر چھوڑ دو۔ اگر بفرض محال ہم ہندوستان سے کافی درآمد بھی نہ کر سکیں تو گاہکوں کو مٹن کی کافی بنا کر کے پلائی جا سکتی ہے۔ اور اس عرصہ میں یہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم خود سندھ میں تمہارے باپ کے مربعوں میں کافی کی کاشت شروع کر دیں گے . . . . "

"چچا! کافی تو صرف پہاڑی ڈھلانوں پر اور مرطوب آب و ہوا میں پیدا ہوتی ہے۔ سندھ میں . . . "

"تت، تت!" عبدالباقی نے ایک پرندے کی سی عجیب آواز نکالی "جس زمین میں گندم اور کپاس اگ سکتی ہے اس میں کیا کچھ نہیں اگایا جا سکتا۔ ابھی تک کسی نے ادھر کافی کی کاشت کی کوشش ہی نہیں کی، تمہارے مربعے سندھ میں ہیں ان میں دو تین ٹیلے بھی ہیں ان کی ڈھلان پر تجربہ کیا جا سکتا ہے خیر! یہ تو بعد کا سوال ہے۔ ابھی تو ہمیں کافی ہاؤس کے لئے مناسب نام تجویز کرنا ہے۔

"نام"، میں نے سلطنت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیوں نا چچا تمہارے نام پر اس کا نام باقی کافی ہاؤس رکھ دیا جائے، باقی اور کافی ہم قافیہ بھی ہیں۔"

چچا عبدالباقی اس سے بظاہر خوش معلوم ہوتا تھا۔ مگر پھر اس نے کسر نفسی کا اظہار کیا، "نام تو موزوں ہے اور میرے دل میں تمہاری اس عقیدت کی قدر ہے، مگر میں ابھی اتنا بڑا آدمی نہیں کہ اس عزت کا اہل بنوں . . . . اور پھر نام میں جدت ہونی چاہئے، جدت بزنس میں کامیابی کا پہلا راز ہے۔ کوئی دوسرا نام۔"

میں نے اسے کئی دوسرے نام تجویز کئے۔ "پاک کافی ہاؤس، قائد کافی ہاؤس، روح افزا کافی ہاؤس" اس نے انھیں پسند نہ کیا۔

"بسم اللہ کافی ہاؤس؟"

"یہ کوئی برا نام نہیں۔ مگر بزنس کے نظریہ سے اچھا نہیں رہے گا، مولوی طبقہ کافی پینے کا زیادہ عادی نہیں جیسا کہ تم جانتے ہی ہو۔"

"آپ کا کافی ہاؤس" میں نے ویسے ہی کہا۔

"بالکل یہی نام ہے۔" چچا عبدالباقی نے صاد کرتے ہوئے کہا "اس نام میں جدت ہے۔ بس اب اللہ کا نام لے کر جنرل منیجر کی حیثیت سے "آپ کا کافی ہاؤس" کے سائن بورڈ کے لئے آرڈر دیدو . . . . "

"مگر چچا جگہ کہاں ہے؟ اور پھر روپیہ کا سوال ہے۔ میری مالی حالت آجکل بہت خستہ ہے۔ کل ہی مجھے اپنے ٹیلر کا نوٹس ملا ہے۔"

"روپیہ!" عبدالباقی نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا "اپنے والد کو کہو کہ تمہیں دو ہزار روپیہ ادھار دیدے چمڑے کے نرخ ان دنوں تیز ہیں اور اس نے خوب ہاتھ مارے ہوں گے۔ یہ انتظام تم کرو اور باقی رہا جگہ کا سوال سو جگہ میں دیتا ہوں۔ میرے ایک دوست محمد باقر کی سوا ماہ میں آہنی بیچوں اور قمیضوں وغیرہ کی دوکان ہے جو غالباً گھاٹے میں چل رہی ہے محمد باقر بھی تمہاری ہی طرح میرا بھتیجا ہے۔ چند دنوں سے وہ دوکان کو نوکر کے ہاتھ میں چھوڑ کر منٹگمری اپنے ماموں کی فاتحہ خوانی کے لئے گیا ہوا ہے۔ اس دوکان کے سامان کو فی الحال اٹھوا کر تمہارے فلیٹ میں رکھا جا سکتا ہے اور تم چاہو تو سائڈ لائن کے طور پر ان قمیضوں اور بیچوں کی فروخت بھی کر سکتے ہو۔ ہم محمد باقر کی فروخت پر دس فیصدی کمیشن چارج کریں گے آخر کمیشن تو ہمارا حق ہے۔ بزنس بزنس ہے۔"

"اور جب محمد باقر واپسی پر اپنے اسٹور کو کافی ہاؤس میں بدلا ہوا دیکھے گا تو ....."

"میں نے اس کی بابت سوچ لیا ہے۔" چچا عبدالباقی نے اطمینان سے کہا "میں اسکو راہ پر لے آؤں گا۔ آخر اسکی قمیضوں کی دوکان منافع پر تو چل نہیں رہی ہے۔ اسے کافی ہاؤس میں دس فیصدی کا شریک بنا لیں گے۔ معقول بندوبست ہے!"

ہم نے اس معاملہ پر کچھ دیر اور بحث کی اور جب میں اس کے گھر سے باہر نکلا تو میں چچا عبدالباقی کا سرمایہ لگانے والا حصہ دار بننے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر قبلہ گاہی سے روپیہ حاصل کرنے کا سوال مجھے فکر مند کر رہا تھا۔

(۲)

میرا باپ ایک شفیق اور با مروت باپ ہے۔ پھر بھی بوڑھے آدمی سے دو ہزار روپے اگلوانے کا معاملہ ٹیڑھی کھیر تھا۔ اس کے لئے نہایت لطیف اور نازک پیرایۂ اظہار کی ضرورت تھی اور اس کی مشکلات کا اندازہ کچھ وہی نوجوان

کر سکتے ہیں جنھیں اپنے والد سے روپے حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے پہلے بزنس کی کوششوں میں افسوسناک ناکامیابیوں کے بعد میں بوڑھے آدمی کی نگاہوں میں اپنا بھرم کھو بیٹھا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ مجھے روپیہ حوالے کرنا پانی سے بدرد میں بہا دینا ہے۔ مجھے اب کے بڑا پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا اور کئی ایک ڈوریں کھینچنی پڑیں۔

میں نے بوڑھے آدمی کو اپنی نئی بزنس کے بارے میں ذرا بھی اشارہ نہ دیا کہ وہ کس نوعیت کی ہے۔ میں نے اس سے اس امر کو مخفی رکھا کہ اس کا کافی سے کسی قسم کا تعلق ہے یا یہ کہ چچا عبد الباقی اس میں بحیثیت ایک حصہ دار کا شریک ہے (یعنی منافع میں) بوڑھے آدمی کی چچا باقی کی کاروباری صلاحیتوں کے متعلق جو رائے ہے اسے اگر یہاں اس کے اپنے الفاظ میں لکھ دیا جائے تو شاید خوش مذاق پڑھنے والوں کی طبع پر گراں گزرے۔ بہرحال میرے باپ کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ جس کاروبار میں چچا عبد الباقی کا ہاتھ ہو گا اس کی سو فیصدی ناکامیابی یقینی امر ہے۔

میں نے اور میری والدہ نے بوڑھے آدمی کو یقین دلایا کہ اس دفعہ میری کامیابی بالکل مسلم ہے اور کامیابی میں شک کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے ایک سب سوچ سمجھ لیا ہے وہ آنکھیں بند کر کے دو ہزار روپے مجھے دے دے۔ صرف دو ہزار روپے۔ اس سے ایک پائی زیادہ نہیں۔ میں انشاء اللہ تین چار مہینے میں اس روپے کو تگنا بنا لوں گا۔ اور اسے خاطر جمع رکھنا چاہئے کہ یہ دو ہزار روپے اسے مع سود کے لوٹا دیئے جائیں گے میں نے اس پر زور دیا کہ یہ دو ہزار میں اس سے بطور قرض حسنہ لوں گا اور دس روپے کے اسٹامپ لگے ہوئے کاغذ پر اقرار نامہ لکھ کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دو ہزار روپیہ مجھے دے دے اور پھر میرے متعلق سب کچھ بھول جائے اور اگر اس کے بعد بھی کسی شخص نے اس سے روپوں کے لئے کہا تو وہ شخص محمد بختیار خلجی نہ ہو گا . . . . . "

بوڑھے آدمی کا دل پسیجا (وہ فطرتاً نرم دل واقع ہوا ہے) خدا جانے وہ میرے ٹھوس دلائل سے مرعوب ہوا یا نہیں۔ بہرحال اس نے مجھے دو ہزار کا چیک اپنے بینک کے نام لکھوا دیا۔ میں نے اسی روز اسے کیش کرایا۔ اور رنگے اور روح افزا کاغذوں سے ٹھنسی ہوئی جیبوں کے ساتھ اور اپنے کو پہلے سے دوگنا محسوس کرتا ہوا۔ میں چچا عبد الباقی کے مکان پر پہنچا تا کہ اسے یہ اچھی خبر سنا دوں۔

دوسرے دن صبح چچا عبد الباقی اور میں سونا دریں محمد باقر کی دوکان پر پہنچے محمد باقر ابھی تک منٹگمری سے نہیں لوٹا تھا۔ دوکان مقفل تھی۔ چچا نے اپنی جیب سے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکالا اور بہت سی چابیاں آزمانے کے بعد اسے کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی تاریک دوکان تھی جس میں لوہے کے حلقے قبضے۔ قفل اور اسی قسم کی زنگ آلود چیزیں بھری پڑی تھیں۔ آدمی اندر بمشکل داخل ہو سکتا تھا۔ اس دوکان کے دائیں طرف ایک پنساری کی دوکان تھی، بائیں طرف عبد الغفور لانڈری ورکس تھی۔ میرا چہرہ ڈھل گیا اور میرے سارے جوش اور ولولوں پر گویا اوس پڑ گئی۔

"تم اس دوکان کو کافی ہاؤس بنانا چاہتے ہو" میں نے چچا عبد الباقی سے کہا

"دیکھو نا" چچا بولا۔ "ذرا ان قبضوں وغیرہ کو باہر اٹھوا لینے دو۔ پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہ جگہ کتنی کھلی ہے۔ ایک کیا یہاں تو پورے دو کافی ہاؤس بنائے جا سکتے ہیں۔ یہی ایک کمرہ تو نہیں، اس کے اوپر محمد باقر کا اپنا رہائشی کمرہ بھی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اس کمرے کو بطور کافی روم کے استعمال کیا جائے ـــ یہ تمہارا انڈیا کافی ہاؤس بھی تو دوسری منزل پر تھا ۔۔۔ ؟"

میں اثبات میں کراہا۔

اوپر کا کمرہ بھی تقریباً دوکان جتنا بڑا تھا — لحافوں گٹھریوں اور زنگ آلود لوہے سے ٹھنسا ہوا اس میں جوہوں کی بو کے ساتھ ایک اور تیز بو رچی ہوئی تھی — سڑے ہوئے پیاز کی بو، عبدالباقی کے دوست کی کھاٹ کے نیچے پیاز کے دو بیسے گھٹے رکھے تھے اور ایک گھی کا ٹین بھی۔ ایک طاقچے پر مصالحوں کی پڑیاں اور ڈبے رکھے ہوئے تھے اور دو کتابیں لذت النکاح حصہ اول اور مشہور عالم جنتری اردو ادب کی نمائندگی کر رہی تھیں ایک کیل سے کھینچنے والے کترتی سپرنگ لٹک رہے تھے جنھیں سینہ کشا کہا جاتا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں مگدروں کی جوڑی بھی رکھی تھی۔ اس سب متاع کو دیکھ کر میں محمد باقر کی ذہنی اور جسمانی ہیئت کا تقریباً اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوگا۔ میرے اندازے نے میرے دل پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا اور کچھ غشی کا سا احساس مجھ پر طاری ہونے لگا۔ مگدروں کو دیکھ کر میری طبیعت ہمیشہ گرنے لگتی ہے۔

"لو یہ کیشو غش فرائی کرنے کے لئے تمہارے پاس خالص گھی کا ٹین بھی موجود ہے۔" چچا عبدالباقی نے خوشی سے اپنی باچھیں چیرتے ہوئے چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے گھی کے ٹین کی طرف اشارہ کیا۔ "فی الحال اسکو استعمال کرو۔ باقر آیا تو اس کو اس کا حساب وغیرہ دیدیں گے۔ میرے خیال میں تو اسے کافی ہاؤس میں تیسرے کا حصہ دار بھی بنانا پڑے گا۔ اس سے کم پر شاید وہ راضی نہ ہو۔"

ہم نے چچا کے اس ریمارک کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

(۱۲)

فوراً ہی چچا عبدالباقی کی ہدایات کے ماتحت "باقر قبضہ سٹور" کو کافی ہاؤس میں تبدیل کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ دو دانت گاڑیاں کرایہ پر لی گئیں، اور دوکان کا کل سامان — قیمے، قفل، مگدر، اور مصالحہ جات کے ڈبے اور کوئی آدھ درجن لحاف — ان میں لدوا کر میرے فلیٹ پر بھجوا دیا گیا دو تین مزدور دیواروں کو سفیدی کرنے اور جگہ کو صاف کرنے پر لگا دیے گئے، مجھے خوب بھاگ دوڑ کرنا پڑی اور یہ میری زندگی کا ایک نہایت مصروف دن تھا۔

"عبدالغفور لانڈری ورکس" پر ایک لمبے ناک والا شخص ایک ٹین کی کرسی پر بیٹھا اس ساری کارروائی کو قدرے مشکوک انداز سے تک رہا تھا۔ میں نے قیاس لگایا کہ یہ غالباً خود پروپرائٹر عبدالغفور ہے، اس کا انداز یقیناً دوستانہ نہ تھا اور جب میں اس کی طرف دیکھتا تھا تو میرے دل میں ایک ڈوبنے کا سا احساس ہونے لگتا۔ وہ غالباً ہمیں چور یا بدمعاش وغیرہ سمجھ رہا تھا۔ مگر ہماری دیدہ دلیری نے اسے کچھ کچھ شک میں ڈال دیا تھا۔

دوپہر کے بعد میں جب باقر قبضہ اسٹور، کا بورڈ اتروا کر "آپکا کافی ہاؤس" کا نیا بورڈ (جو اسیوقت پینٹر کے یہاں سے آیا تھا) اس کی جگہ لگوا رہا تھا تو میرے کندھے پر ایک ہاتھ پڑا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، میرا رنگ قدرے فق ہو گیا۔ یہ وہی لمبی ناک والا عبدالغفور لانڈری ورکس کا پروپرائٹر تھا اس نے قمیض کی آستین چڑھا رکھی تھی۔

"معاف کیجئے" وہ بولا "آپ کون لوگ ہیں"

چچا عبدالباقی جو دوکان کے اندر دوسرے کاموں کی نگرانی کر رہا تھا باہر آ گیا۔

"فرمائیے کیا پوچھتے ہیں آپ" چچا عبدالباقی نے اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھ کر عبدالغفور کو نہایت مرعوب کن انداز سے دیکھا۔

"اس دوکان پر آپ نے کس طرح قبضہ کیا ہے؟"

"قبضہ"! عبدالباقی ہنسا "دکان ہی ہماری اپنی ہے۔ محمد باقر میرا بھتیجا ہے ہم اپنے لوہے اور قبضوں کے سامان کو ایک اور دکان میں منتقل کر رہے ہیں اور اس دکان کو کافی ہاؤس بنا رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"بھائی باقر جانتے ہوئے بھی کہہ گیا تھا کہ میری دوکان پر نگاہ رکھنا" اس لئے میں نے پوچھا تھا۔

"اور ہم کو وہ دوکان کی چابی دے کر گیا تھا" چچا عبدالباقی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کی تسلی ہو گئی آپ اس عبدالغفور لانڈری ورکس کے پروپرائٹر ہیں نا، گرم سوٹ کی دھلائی کیا لیتے ہیں آپ؟"

لانڈری ورکس والا چچا عبدالباقی کو دھلائی کے نرخ بتا کر پھر فوراً اپنی دوکان پر چڑھ کر آہنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب کرسی کی پیٹھ ہماری طرف تھی، اور اس نے قمیض کی آستینوں کو اتار دیا تھا۔

(۴)

چچا عبدالباقی غیر ضروری اخراجات سے حتی الامکان احتراز کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ بزنس میں کامیابی کا یہ دوسرا راز ہے۔

اس غیر ضروری اخراجات سے بچنے کے لئے چچا کے مشورہ کے مطابق میں اپنے فلیٹ سے اپنا بیشتر فرنیچر، دو دریاں، ایک غالیچہ لدوا کر "آپ کا کافی ہاؤس" میں لے آیا۔ میرا فلیٹ اب خالی اور غیر آرام دہ نظر آنے لگا تھا۔ دوکمروں اور چھوٹے سے صحن میں تو باقر فینسی سٹور کا سامان پھیلا ہوا تھا اور زنگ آلود لوہے کی بو فضا بھاری وساری تھی، اس فلیٹ میں رہ کر اب کوئی بھی شخص اپنا دل کا چین قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔

جب میرا اپنا غالیچہ اوپر کی دوکان کے بالائی کمرہ میں بچھا دیا گیا تو چچا عبدالباقی نے ہاتھ ملتے ہوئے اور اپنے آپ کو اپنی حسن کارکردگی پر تحسین کرنے کے انداز میں کہا "یہ پہلا کافی ہاؤس ہو گا جس کے کافی روم کے فرش پر غالیچہ ہو گا۔"

نچلی دکان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، داخلے پر ایک چھوٹا سا "کاؤنٹر" بنا دیا گیا (چچا ایک سیکنڈ ہینڈ فرنیچر کے ڈیلر سے ایک سٹول اور ایک اونچا ڈرائنگ ڈیسک خرید لایا تھا) ایک پردہ دکان کے وسط میں لٹکا دیا گیا، اس کے پیچھے باورچی خانہ کے لئے چولہے وغیرہ بنوا دیئے گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دس کافی سیٹ چوڑیا بازار سے ایک تھوک فروش سے پہلے ہی روز خرید کئے جا چکے تھے۔ میں بھی اپنا چائے کا سیٹ فلیٹ سے یہیں لے آیا اور چچا عبدالباقی نے کمال فیاضی سے ایک بے ڈھنگم بغیر ڈھکنے کی چائے دانی اور دودھ کا ایک قدرے شکستہ جگ کافی ہاؤس کو تحفتاً مرحمت فرمائے، تازہ کافی مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہم نے بازار سے ایک درجن انسٹنٹ کافی کے ڈبے خرید کر لئے اور کافی بنانے کے لئے میرے اپنے نوکر قادر بخش کو مقرر کر دیا گیا۔ چچا عبدالباقی نے ایک دو گھنٹے قادر بخش کو کافی پر جنرل لیکچر دینے اور اسے یہ سمجھانے پر صرف کئے کہ کافی کے تیار کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور یہ کہ کافی کے بیجوں کو اچھی طرح پیسنا کیوں اس قدر ضروری ہے۔

مگر چچا" میں نے ٹوکا "ہمارے پاس تو تازہ کافی کے بیج نہیں، اس ڈبوں کی کافی کو تو پیسنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بنانے کی ترکیب تو ایسی پیچیدہ نہیں۔"

"میں قادر بخش کو فی الحال کافی پر ایک جنرل لیکچر دے رہا تھا، یہ لیکچر اس وقت اس کے کام آئے گا جب ہماری اپنی زمین پر تازہ کافی اگنے لگے گی اور ہم یہ ڈبوں کی کافی استعمال نہیں کریں گے۔ انسٹنٹ کافی کے بنانے کی ترکیب میں ابھی اسکو سمجھانے ہی والا تھا۔ ذرا مجھے انسٹنٹ کافی کا ایک ڈبہ لا دو۔"

میں نے اسے ایک ڈبہ لا کر دیا اور اس پر لکھی ہوئی ہدایات کو ترجمہ کر کے قادر بخش کو ترکیب سمجھانے لگا۔

ابھی ہمارے گاہک آنے شروع نہیں ہوئے تھے ــــ آپ کا کافی ہاؤس سفیدی کے باوجود ابھی تک ایک حد درجہ مکروہ اور ممنوع کن سی جگہ تھی۔ فینائل کے فیاضانہ استعمال کے باوجود مرے ہوئے چوہوں اور سڑی ہوئی پیاز کی بو ابھی پوری طرح گئی نہ تھی۔ اس جگہ کو کافی ہاؤس میں تبدیل کرنے میں پانچ چھ سو روپیہ ابھی تک خرچ آ چکے تھے اور اب میرے لئے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس بیل کے منڈھے چڑھنے کے آثار زیادہ روشن نہ تھے۔ مگر چچا عبدالباقی گرم جوش اور اعتماد سے پُر تھا۔

۵

میرا دلی چین اب رخصت ہو گیا۔ شام کو جب میں اپنے فلیٹ پر واپس لوٹا تو میرے دل پر برچھیاں سی چلنے لگتیں۔ یہ رہنے کی ایک شریفانہ جگہ کی بجائے اب ایک ننگ آلود لوہے کے کباڑیئے کا سٹور بن گیا تھا۔

چچا عبدالباقی کے مشورہ سے باقر کی دوکان کا سائن بورڈ اب میرے فلیٹ کے دروازہ پر لگا دیا گیا تھا ــــ "باقر قبضہ اسٹور"

میرا خیال ہے "آپ کا کافی ہاؤس" کو وجود میں آئے ہوئے تیسرا ہی روز تھا کہ میں صبح دس بجے اپنے فلیٹ میں کافی ہاؤس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ دستک دینے والا ایک چھوٹا سا پھولا ہوا مینڈک نما شخص تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا سیاہ کوٹ اور ایک گول ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور جس پھرتی سے وہ پان کی جگالی کر رہا تھا فی الواقع تعجب انگیز تھی۔

"تم اس قبضہ سٹور کا مالک ہے؟" اس نے ساتھ کی دیوار پر دلفریب پچکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں"

"اپنا مال کدھر ہے۔ گودام کون بازو میں ہے؟"

"یہیں اندر ہے" میں نے اشارہ کیا۔

"ہم کو کچھ قبضہ وغیرہ چاہئے۔ مال نیا ہے یا جونا؟"

"اندر آ کر دیکھ لیجئے۔"

جس انداز سے وہ شخص اندر داخل ہوا اور جس بے تکلفی سے اس نے میرے غریب خانے کے فرش اور در و دیوار پر پیک کے بیل بوٹے بنائے، اس سے آپ یہ سمجھئے کہ یہ مکان ہی اس کا اپنا ہے اس نے آ کر قبضوں پر نگاہ ڈالی اور کچھ سوچ کر بولا "اپنے کو بیچنا ہے نا؟"

"ارادہ تو یہی ہے" میں نے عبدالباقی کی ہدایات کو یاد کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مال جونا ہے" اس نے دو تین قبضوں کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد سر ہلا کر کہا۔

اس نے ایک قبضہ اٹھایا "یہ کتنا گراس ہے"

اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ دروازوں کے قبضوں کی فروخت سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ابھی تک مجھے قبضہ خریدنے کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مجھے اس کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ کس نرخ پر فروخت ہوتے ہیں پہلے میں نے سوچا کہ اس شخص کو پھر شام کو آنے کے لئے کہوں گا، اور اب جا کر چچا عبدالباقی سے مشورہ کروں گا کہ ان کو کس بھاؤ پر بیچا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر غالباً یہ خیال کر کے کہ ایک کاروباری آدمی کو سمجھ بوجھ کا ثبوت دینا چاہئے اور میں نے ویسے ہی کہہ دیا ــــ

"دو پانچ آنے"

"پانچ آنہ گراس" اس آدمی نے کہا۔

"پانچ آنہ گراس" میں نے جواب دیا۔

میں نے اسے اپنی طرف سے ایک قبضے کے دام بتائے تھے۔ . . . اور اب میں اسے گراس کے لئے اپنی زبان دے چکا تھا۔ سکول میں حساب میں خاص طور سے کمزور ہونے کی وجہ سے گراس کے متعلق میرا اندازہ کچھ دھندلا تھا، درجن کے متعلق تو مجھے یقین تھا کہ اس میں بارہ ہوتے ہیں۔ مگر گراس؟ —— غالباً تین چار۔

اس نے مجھ سے پھر پیچوں، کیلوں اور کنڈوں وغیرہ کے نرخ پوچھے اور میں نے اسے اسی طرح ویسے ہی نرخ بتا دیئے، ان چیزوں کے دام بتاتے وقت میں نے نرخ کچھ اونچے رکھے۔ کچھ وقفے کے بعد اس شخص نے کہا کہ وہ ابھی ایک منٹ میں آ رہا ہے۔ دو تین منٹ کے بعد وہ واپس لوٹا۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ایک دوہری ٹھوڑی اور چوڑی چہرے والا شخص تھا، ان کے پیچھے پانچ چھ مزدور ٹوکریاں اور تھیلے لئے ہوئے تھے وہ مجھے نظر انداز کر کے گن گن کر پیچوں اور قبضوں کو بوریوں میں بھرنے لگے اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ گراس میں بارہ درجن ہوتے ہیں۔ زمین میرے پاؤں سے نکل گئی۔

میں نے بڑبڑانے کی کوشش کی۔ میں نے ایک درجن کے نرخ بتائے تھے، مگر میرے الفاظ غالباً ناقابل سماعت تھے۔ میں خود بھی ان کو اچھی طرح نہیں سن پایا۔

مزدور بوریاں بھر کے نیچے لے گئے اور جلد ہی خالی بوریاں لے کر اوپر آ گئے۔ مختصراً یہ کہ محمد باقر کا تین چوتھائی سٹور ان دو میمنوں نے پینتالیس روپے کچھ آنے کے عوض خرید لیا، جاتے وقت ایک میمن نے دوسرے کو کہنی ماری اور پہلا میرے صحن کے فرش پر ملمع کاری کرتے ہوئے بولا "ہمارا دکان ادھر سامنے ہی میمن مسجد کے بازو میں ہے حاجی حسین بھائی قاسم بھائی۔ تمہارا نیا سٹاک آئے تو ہم کو بولو"، اس نے مجھے فیاضی سے ایک بیڑی پیش کی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے حساب لگایا، پینتالیس روپیہ میں ہمارا فروخت کا کمیشن دس فیصدی کے حساب سے تقریباً ساڑھے چار روپیہ تھا اس ساڑھے چار روپے میں میں اور چچا پچاس پچاس کے حصہ دار تھے۔

کافی ہاؤس جانے پر جب میں نے چچا عبدالباقی سے باقر کے مال کی فروخت کے متعلق بتایا اور اسے وہ نرخ بتائے جس پہ میں نے مال کو بیچا تھا تو اس نے زیادہ ناخوشی کا اظہار نہ کیا۔ دراصل اسے لوہے کے قبضوں وغیرہ کے بھاؤ کا بھی مطلق اندازہ نہ تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ اسے بھی یہ معلوم نہ تھا کہ گراس کتنے کا ہوتا ہے، شام کو ایک آہن فروش سے پوچھ گچھ کرنے پر مجھے یہ پتہ چلا کہ میمنوں نے مجھے خوب بے وقوف بنایا تھا اور ڈھائی تین ہزار کا مال ساڑھے پینتالیس روپے میں مار لے گئے تھے۔

(۶)

باقر فیضہ سٹور کو کافی ہاؤس میں تبدیل ہوئے غالباً چوتھا روز تھا، میں کاؤنٹر کے سٹول پر بیٹھا صبح سے گاہکوں کا انتظار کرتا کرتا تھک گیا تھا، میرے لمبے بالوں والے، دبلے، انٹلیکچوئل قسم کے شخص کو جو سامنے سے گذرتا میں پرامید نظروں سے دیکھتا، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اندر آنے کی دعوت دیتا، یہ سب لوگ ہمارے بورڈ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر منہ پہلی طرف پھیر لیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انٹلیکچوئل حضرات کے لئے اب کافی کا لفظ کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔

تین بیرے جنہیں ہم نے دو روپیہ روز، گاہکوں کے ٹپ میں پچاس پچاس کی شرکت اور کافی کے لامحدود پیالوں پر

لازم رکھا ہوا تھا، بیٹھے اونگھ رہے تھے، وہ مجھے کچھ کچھ تمسخرانہ انداز سے دیکھ رہے تھے، اور ان کے اس گستاخانہ انداز نے مجھے اپنے سٹول پر بے چین کر دیا تھا (یہ ایک اونچا سخت غیر آرام دہ اسٹول تھا۔ اس قسم کا سٹول جو عموماً ہسپتالوں میں نظر آتا ہے) چچا عبدالباقی ہر پانچویں منٹ اوپر کافی روم سے (جہاں اس نے باقر کے غسل خانے کو اپنا آفس بنا رکھا تھا) اپنے ہاتھ ملتا ہوا اور چہرے پر ایک تلطف آمیز پدرانہ مسکراہٹ لئے نیچے کاؤنٹر پر آتا اور مجھ سے دریافت کرتا کہ بزنس کیسی ہو رہی ہے۔ پانچ بجے شام تک چچا اور میں کافی کے پانچ پانچ پیالے پی چکے تھے، انکے دام ہمارے حساب میں درج کر دیئے گئے کیونکہ انتظامیہ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں یہ طے کیا جا چکا تھا کہ ہم کافی مفت نہیں پئیں گے بلکہ اس کے دام ادا کریں گے، بیروں کو دو دو کافی کے پیالے ان کی خوش طبعی اور آسودہ دلی کو برقرار رکھنے کے لئے ہمارے حساب میں پلائے گئے تھے۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب ایک باریک مونچھوں والا، بلغمی مزاج شخص ایک ہاتھ میں ایک تھیلا اور دوسرے میں ایک ٹوکری اٹھائے اندر آیا۔

میں نے پُر امید میزبانہ خوش خلقی سے کہا، "اوپر تشریف لے چلئے، کافی روم اوپر ہے"

بیرے تیزی سے اپنی بیزاری کو جھاڑتے ہوئے اٹھے۔

"معاف کیجئے"، اس شخص نے تھیلے اور ٹوکری کو اپنے کاؤنٹر پر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا، "میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں"، تھیلے میں لہسن، شلجم، مولیاں اور گاجریں وغیرہ تھیں اور ٹوکری میں سے ایک مرغی اپنی بٹنوں سی گول آنکھوں میں سے باہر جھانک رہی تھی۔

"فرمائیے"، میں نے کہا، مرغی پھڑپھڑاتی اور کٹ کٹاتی ہوئی ٹوکری میں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اور مجھے بات کرتے وقت اپنی ایک آنکھ اس طرف رکھنا پڑی۔

"اس دوکان پر آپ نے قبضہ کیسے کیا، یہ دوکان تو میرے خالو مولوی محمد باقر کی ہے"

"دوکان تو انہی کی ہے" میں نے جواب دیا، "صرف اسے قبضہ اسٹور سے کافی ہاؤس بنا دیا گیا ہے، محمد باقر صاحب بھی اس میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔"

"عجیب قصہ ہے" وہ تو یہاں نہیں ہے۔ کل ہی ان کا مجھے منٹگمری سے خط ملا ہے کہ میری دوکان کا خیال رکھنا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے"

مرغی ٹوکری کی جالی میں سے آدھی باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی، محمد باقر کے بھانجے نے اسے دوبارہ نیچے دبایا۔

اتنے میں چچا عبدالباقی اپنے ہاتھ ملتا ہوا مجھ سے بزنس کا حال پوچھنے اور کافی کا ایک پیالہ پینے کے لئے نیچے آیا، میری جان میں جان آئی، میں نے محمد باقر کے بھانجے کو اس کے حوالے کر دیا۔

"یہ صاحب محمد باقر صاحب کے بھانجے ہیں" میں نے بلغمی مزاج شخص کو چچا سے متعارف کرتے ہوئے کہا۔

"آئیے آئیے، آپ باقر صاحب کے بھانجے ہیں"، چچا نے مصافحے کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، "آئیے نا اوپر آفس میں تشریف لے چلئے، کیوں بختیار، دو کافی اوپر بھجواؤ اور دو پلیٹ کیشو منٹ بھی۔ . . . "

نووارد اور چچا اوپر سیڑھیوں پر چڑھنے لگے ــــ نووارد آگے آگے اور مڑ مڑ کر اپنے سبزی کے تھیلے اور مرغی کی طرف نگاہ ڈالتا ہوا اور چچا اس کے پیچھے اس کو اپنے ہاتھ سے سہارا دیتا اور دھکیلتا ہوا، جس نے ایک بیرے کو فوراً کافی اور کیشو منٹ اوپر لے جانے کے لئے کہا۔ باقر کا بھانجا کوئی بیس منٹ اوپر رہا اور میں اس عرصہ میں

اس کی مرغی کی حفاظت کرتا رہا جو ٹوکری میں سے باہر آنے کی بار بار کوشش کر رہی تھی۔

بیس منٹ کے بعد بھانجا نیچے آیا، وہ سراپا مسکراہٹ تھا، اس کے ہونٹ چکنے تھے اور کلیجہ منٹ کے دو ذرّے اس کی مونچھوں میں چپکے ہوئے تھے۔ چچا عبدالباقی سے وہ ہاتھ بار بار ہاتھ ملا رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ وہ اسے دوکان سے باہر پہنچانے کی زحمت نہ کریں۔ وہ اس قدر بشاش اور مطمئن معلوم ہوتا تھا کہ جب وہ میرے سامنے سے گذرا تو اس کی چال ایک خاص قسم کی انگریزی رقص والٹز سے مشابہ تھی، وہ پہلی بار ناچتا ہوا دوکان کے نیچے اتر گیا اور اپنے تھیلے اور ٹوکری کو میرے کاؤنٹر پر بھول گیا، اسے ان کے لئے واپس آنا پڑا۔

جب وہ چلا گیا تو چچا عبدالباقی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا "میاں کاروباری آدمی بنو، آدمیوں سے نبٹنا سیکھو۔ اب دیکھو اس کو منٹوں میں سیدھا کیا ہے کیسے اطمینان سے گیا ہے، میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ باقر اور ہم نے مل کر یہ کافی ہاؤس کھولا ہے اور یہ کہ اس کے قبضوں سے سامان کی دوکان کو کھا کر میں منتقل کر دیا گیا ہے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ باقر میرا اپنا بھتیجا ہے۔"

چچا عبدالباقی کی پروقار بزرگانہ شخصیت ہر شخص کو مرعوب اور گرویدہ کر لیتی ہے اور اس کا گول معصوم دوستانہ چہرہ ہر کس و ناکس کا دل جیت لیتا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"ذرا اوپر آفس میں آؤ" چچا عبدالباقی نے مجھے ہدایت دی۔ "اب ذرا ہائی لیول پر حصہ داروں کی میٹنگ ہوگی۔"

جب ہم اوپر چچا کے آفس میں بیٹھ گئے — چچا اپنی کرسی میں اور میں سامنے میز کے اوپر — تو چچا نے بحیثیت مینجنگ ڈائرکٹر مجھ سے استفسار کیا۔ "آج بزنس پوزیشن کیسی تھی؟" جیسا کہ وہ خود نہ جانتا ہو۔

"بارہ کافی کے پیالے بکے ہیں،" میں نے جواب دیا "پانچ تم نے پیئے ہیں۔ پانچ میں نے اور تم نے بعد میں اوپر باقر کے بھانجے کی تواضع کرنے کے لئے منگوائے تھے، اور ہاں ایک پلیٹ کیشو منٹ بھی۔"

"بزنس کچھ مدھم ہو رہی ہے،" چچا نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا اور اس انداز سے جیسے کہ بزنس کبھی تیز بھی رہی ہو۔ "اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، تمہارے اس قدر دوست، فنکار، ادیب اور آرٹسٹ وغیرہ ہیں ان کو کیا کرو تاکہ یہاں آیا کریں، اور دن کا بیشتر حصہ یہاں گذارا کریں، ان کے یہاں آنے سے یہاں کی فضا انٹیلیکچول ہو جائیگی اور پھر خود بخود لوگ یہاں ٹوٹ پڑیں گے۔"

"میں کوشش کروں گا،" میں نے بے دلی سے کہا۔

"اور پھر ہم نے پبلسٹی بھی تو نہیں کی، لوگوں کو پتہ نہیں کہ نیا کافی ہاؤس کہاں ہے، ذرا سوچو محض اس وجہ سے کہ لوگوں کو اس جگہ کا پتہ نہیں آج کتنے آرٹسٹ اور انٹیلیکچول صدر اور الفنسٹن سٹریٹ میں بھٹکے بھٹکے اور اداس پھرتے رہے ہوں گے۔ پبلسٹی بڑی ضروری چیز ہے، یہ کاغذ اور قلم لو۔ "ایوننگ سٹینڈرڈ" کے لئے ایک اشتہار لکھو۔"

میں نے کاغذ لے کر چچا کی ڈکٹیشن کے مطابق لکھنا شروع کیا۔

"انڈیا کافی ہاؤس بند ہو گیا۔ تو آپ مایوس کیوں ہیں، آپ کیوں اداس سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں، آپ کیوں ایسی پناہ کے لئے آہیں بھرتے ہیں، جہاں آپ کافی کے ایک مفرح پیالے میں اپنے آلام اور اپنے غم ڈبو سکیں جس پناہ گاہ کے آپ متلاشی ہیں وہ آپ کے قریب ہی تو ہے — سونا دریں عبدالغفور لانڈری ورکس کے بالکل بازو میں، یہاں آپکو شہر میں بہترین کافی ملے گی، یہاں آپ کو خالص گھی میں تلے ہوئے کیشو منٹ بھی ملیں گے، ہاں کیشو منٹ! مینجنگ ڈائرکٹر اور جنرل منیجر دونوں آپ سے خوش خلقی سے پیش آئیں گے۔ دستخط مینجنگ ڈائرکٹر ایچ اے باقی

"اس اشتہار کو ابھی ایوننگ سنیٹل کے دفتر میں بھجوا دو" چچا نے کہا۔ "چوتھائی کالم کے غالباً پچاس پچپن لگیں گے۔"

"پچپن" میرا دل ڈوبنے لگا — میرا — میرے باپ کا قیمتی، پسینے سے کمایا ہوا روپیہ بدر وں میں بہایا جا رہا تھا۔ چچا نے مجھے روکا۔

"ہاں ٹھہرو، بھئی بھتیجا، میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ کل آپ کا کافی ہاؤس کا یوم افتتاح منایا جائے، اس سے خوب پبلسٹی ہوگی — یہ یوم افتتاح کا تو ہمیں خیال ہی نہ آیا تھا، میں بھی سوچ رہا تھا کوئی چیز ہم بھول گئے ہیں۔ اشتہار میں اس کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ — ہاں یہ بتاؤ افتتاح کس سے کرایا جائے۔"

"کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے" میں نے کہا۔ "اگر کوئی منسٹر ہو تو بہت اچھا ہے، وزیر صنعت و حرفت پرانا علیگرین ہے۔"

"وزیر صنعت غالباً آج دورے پر ہے" عبدالباقی بولا۔ "سکھر میں بسکٹ فیکٹری والوں نے ہڑتال کر دی ہے۔"

"اس صورت میں اس کے پارلیمنٹری سیکرٹری سے کام چل جائے گا۔"

"وہ اس کے ساتھ گیا ہوگا۔"

مجھے خیال سوجھا۔ "افتتاح کے لئے کیوں نا ہمارے موقر روزناموں کے مدیروں میں سے ایک کو مدعو کر لیا جائے — مثلاً الخام کا مولانا قلندر بخش، ایوننگ سنٹینل کا ٹی ایل گھہری — تکبیر کا حاجی ۔ ۔ ۔"

"بس ٹی۔ ایل گھہری ٹھیک رہے گا، اشتہار بھی ہم اسی کے اخبار میں دے رہے ہیں۔ حکومت میں اس کا اچھا رسوخ ہے اور اسے ہاتھ میں رکھنا مفید ہوگا۔ اچھا اشتہار میں یہ فقرہ بڑھا دو کہ ایوننگ سنٹینل کے ایڈیٹر مسٹر ٹی ایل گھہری کل شام کو چھ بجے 'آپ کا کافی ہاؤس' کا افتتاح فرمائیں گے، سب کو محبت سے مدعو کیا جاتا ہے۔"

"لیکن پہلے ہمیں گھہری سے تو پوچھ لینا چاہئے" میں نے کہا، "فرض کرو وہ انکار کر دے۔"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو" چچا عبدالباقی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ اشتہار کا مضمون بھی مجھے دو، میں ابھی سیدھا گھہری کے پاس جاتا ہوں اور اس سے فیصلہ کر کے آتا ہوں۔ کوئی وجہ ہے کہ نہ آئے، آخر ہم اس کی عزت افزائی کر رہے ہیں — اور مجھے اشتہار کے لئے ساٹھ روپے بھی چاہئیں۔"

عبدالباقی اسی وقت ٹیکسی میں "ایوننگ سنٹینل" کے دفتر کو چلا گیا۔ چچا کی خود اعتمادی اور بشاشت مجھے بھی لگ گئی تھی اور میں اس وقت گانے کے موڈ میں تھا۔ لیکن جس گیت کے بول ابھی میرے ہونٹوں پر تھے "عبدالغفور لانڈری ورکس" کی طرف نظر دوڑانے سے فوراً ختم ہو گئے۔ وہی باقر کا بھانجا جو آدھ گھنٹہ پہلے سراپا بشاشت کی تصویر بنا ہمارے کافی ہاؤس کی سیڑھیوں سے ناچتا ہوا اترا تھا وہاں موجود تھا وہ اور لمبی ناک والا عبدالغفور جس نے پھر آستینیں چڑھا لی تھیں میری طرف قاتلانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، چچا عبدالباقی کا کیا ہوا جادو اتر چکا تھا اور ان کے اصل شبہات پھر عود کر آئے تھے میں نے نوٹ کیا کہ باقر کے بھانجے کے فل بوٹوں کے تلووں میں موٹے کیل لگے ہوئے ہیں اور غالباً کسی تحت الشعوری جذبہ کے ماتحت میں اپنا سر کھجانے لگ گیا۔

(۷)

افتتاحیہ ڈنر کے لئے ہمیں کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ چچا عبدالباقی کے مکان سے اس کے وہ تاریخی صوفے منگوائے گئے۔ جن کے سپرنگ اب ٹھوس ہو چکے تھے اور جن پر یکلخت بیٹھنے سے ایک ناخوشگوار تعجب ہوتا تھا۔ ایک وائرلیس کمپنی سے لاؤڈ سپیکر کا انتظام کیا گیا تاکہ بازار میں لوگ افتتاحیہ کارروائی اور مسٹر گھہری کی افتتاحیہ تقریر سننے سے محروم نہ رہ جائیں۔ چچا عبدالباقی کی معزز بہ وقار شخصیت سے متاثر ہو کر گھہری نے بمعہ اپنی بیوی کے آپ کے

کافی ہاؤس میں آنے اور اس کا باقاعدہ افتتاح کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ میں چار پانچ گھنٹے اپنے اشتیاق پسند دوستوں کے گھروں میں انکا کھوج لگاتا پھرا، ہم چاہتے تھے کہ افتتاح پہ اچھا خاصہ مجمع ہوجائے، میرے دوستوں میں سے بیشتر نے معذرت کی کہ وہ شام کو مصروف ہیں اور افتتاح میں شمولیت نہیں کر سکتے۔ لیکن میرے یقین دلانے پر کہ کافی بالکل مفت ہوگی، انھوں نے میری دوستی کی خاطر اپنی مختلف مصروفیات کو کسی اور دن کے لئے اٹھا رکھا اور آنے کا وعدہ کیا، یہ اچھا ہوا یہ لوگ آگئے ورنہ غالباً مسٹر گلہری کو اپنی افتتاحیہ تقریر صرف منتظمین اور بیروں کے سامنے کرنی پڑتی۔

افتتاح کے وقت سے ذرا پہلے چچا عبدالباقی کو خیال آیا کہ گلہری کے لئے ایک بینڈ بھی ہونا چاہئے اتفاق سے پاس ہی کوئی شادی تھی، وہاں سے دو بینڈ والوں کو بڑی منت سے پندرہ منٹ کے لئے بہلا پھسلا کر لایا گیا، ایک ڈھول والا تھا دوسرا چھن چھن بجنے والی تھالیوں والا، انھوں نے آتے ہی دھوم دھام سے اپنا کام شروع کر دیا ہم گلہری کا ایک باقاعدہ شاہانہ سواگت کرنا چاہتے تھے۔

چھ بجکر پانچ منٹ پر مسٹر گلہری اور مسز گلہری اپنے سر کھڑکی میں سے باہر نکالے آہستہ آہستہ ٹیکسی میں وہاں سے گذرے وہ افتتاحیہ جگہ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے آگے جا رہے تھے کہ چچا عبدالباقی نے بازو ہلا کر اور ایک نعرہ سا لگا کر ان کو ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ جب گلہری اور مسز گلہری ٹیکسی میں سے اترے ہمارے بینڈ والے "بترا نہر گلہ بندنی ہے جانو" کا گیت بجا رہے تھے اور چچا اور میں اور میرے آدھ درجن دوست ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے گلہریوں کے استقبال کے لئے تیار تھے۔

افتتاحیہ شام کی کارروائی کی روئداد ہماری مینجمنٹ فائلز میں مکمل طور سے درج ہے یہاں اتنا ہی لکھوں گا کہ ٹی۔ ایں گلہری اپنے استقبال کی وجہ سے بے مدہوش نظر آتا تھا۔ مجھے "ایوننگ سنٹینل" کے ایڈیٹر کی حیثیت میں اسے دیکھنے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا کیونکہ اس کے بعد جلد ہی "ایوننگ سنٹینل" بند ہوگیا، اور گلہری کو کسی جنوبی امریکہ کی ریاست میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا، ٹی ایں گلہری جسمانی طور پر اپنے نام کی توقعات پورا کر رہا تھا اور حیرت ناک طور پر ایک گلہری سے مشابہ تھا، مسز گلہری ایک بھاری جثے کی مغلوب کن انگریز عورت تھی گلہری سے آٹھ دس سال بڑی، اس کا چہرہ دلیر زاویوں پر مشتمل تھا صحافتی حلقوں میں مشہور یہ تھا کہ مسٹر گلہری نے اس عورت سے اس لئے شادی کی تھی تاکہ وہ گلہری کے اداریوں کی انگریزی کو صاف اور درست کر سکے "ایوننگ سنٹینل" کے اداریے عموماً مسز گلہری ہی لکھا کرتی تھی۔

گلہری نے کافی نوشی کے بعد اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اسے اس کافی ہاؤس کا افتتاح کرتے ہوئے بیحد مسرت ہو رہی ہے اور وہ امید کرتا ہے کہ یہ کافی ہاؤس پاکستان کی ثقافتی اور تمدنی ترقی میں ایک قابل قدر حصہ لے گا، اس نے چچا عبدالباقی کی انتظامی قابلیت کے متعلق بھی چند لفظ کہے۔

گلہری نے دوسرے دن اپنے گپ شپ کے کالم میں "آپ کا کافی ہاؤس" کا ذکر کر کے ہمارا حق کافی ادا کر دیا اس نے اپنے اخبار کے پڑھنے والوں سے سفارش کی کہ وہ اس کافی ہاؤس کو پیٹرنائز کریں اور پروپرائٹر کو کافی کے ساتھ کیٹو منٹ مہیا کرنے پر سراہا۔ اسی کالم میں وزیر خوراک کی توجہ اس کافی ہاؤس کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس نے اسے (وزیر خوراک کو) مشورہ دیا کہ ہمیں کافی اور کھانڈ مہیا کرنے میں پوری دریا دلی سے کام لیا جائے کیونکہ کافی ہاؤس ملک کے تمدن کو ابھارنے میں حکومتوں سے زیادہ کام کر سکتے ہیں، اس نے اس میں مینجنگ ڈائرکٹر

عبدالباقی کے جذبہ حب الوطنی کی تعریف کی اور تسلیم کیا کہ عبدالباقی صاحب نے ان نامساعد حالات میں ملک کی کلچرل بہتری کے لئے ایک نہایت مفید قدم اٹھایا ہے اس کالم کو چار پانچ مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی مجھے اپنا نام کہیں نظر نہ آیا۔

⑧

مگر افتتاحیہ ڈسے کے باوجود مسٹر گھری کی گپ شپ کے کالم میں پبلک اور حکومت سے سفارش کے باوجود پھر بھی کاروبار ہدستور ہی رہا (سوائے ان پیالوں کے جو چچا باقی اور میں پیتے تھے) مجھے زیادہ کافی پینے سے شب بیداری کی شکایت ہوگئی اور چچا عبدالباقی جو کافی کا عادی نہ تھا اپنے سر اور معدے میں کچھ مبہم آوازیں سننے لگا ہمارا چینی کا سٹاک بھی تقریباً ختم ہو چلا تھا بنک ہم اپنے ذاتی راشن کی چینی سے کام چلا رہے تھے کافی ہاؤس کے لئے چینی کے پرمٹ کی جو ہم نے درخواست دی تھی اس کا کچھ نہیں بنا تھا۔

چچا عبدالباقی کی خوش اعتقادی میں ذرہ بھر کمی نہ آئی تھی۔

جب میں اپنے دوستوں کو آپ کا کافی ہاؤس میں آ کر کافی پینے پر نہ اکسا سکا تو "ایوننگ سنٹینل" میں ایک اشتہار دیا گیا کہ ہم کو چند لمبے بالوں والے انٹیلیکچوئیل لوگوں کی ضرورت ہے جن کا کام سارا دن کافی ہاؤس میں بیٹھنا ہوگا۔ ان کو مفت کافی اور آٹھ آنہ یومیہ دیا جائے گا، چچا کا خیال تھا کہ یہ لوگ ایک طرح تحریص کے دانہ کا کام دیں گے جس سے دوسرے انٹیلیکچوئیل یہاں رفتہ رفتہ آنے لگیں گے۔ جب سے ٹی ایل گھری نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں اس کی انتظامیہ قابلیت کی تعریف کی تھی، چچا عبدالباقی کی اپنی کاروباری صلاحیتوں کے لئے رائے پہلے سے دوچند ہوگئی تھی۔

"ایوننگ سنٹینل" میں اشتہار کا اثر یہ ہوا کہ اس کے دوسرے روز جب میں کافی ہاؤس پہنچا تو اس کے باہر وحشی آنکھوں اور پھیلے ہوئے متوحش بالوں والے نوجوانوں کا ایک ہجوم تھا، چچا عبدالباقی سارا دن ان سے ایک ایک کرکے اپنے آفس میں انٹرویو کرتا رہا اور بالآخر چار انٹلیکچوئل جن کے بال کمر تک آتے تھے اور جو کالرج کی نظم "قبلا خاں" کے شاعر کی طرح شہد آگیں شبنم اور بہشت کے دودھ پر پلے ہوئے معلوم ہوتے تھے منتخب کر لئے گئے۔

ان کے آنے سے یہ ہوا کہ کافی ہاؤس کی رونق بڑھ گئی مگر کافی کی مقدار جو وہ پی سکنے کے اہل تھے واقعی حیران کن تھی ان میں سے ہر ایک پندرہ بیس پیالے پی جانے کو مذاق سمجھتا تھا (ان میں سے ایک کا تو پہلے روز ہی گھر جا کر انتقال ہو گیا مرحوم نے دو درجن پیالے پی ڈالے تھے)

مجھے یاد ہے جب ہمارے پہلے گاہک آئے، انھوں نے اپنے سائیکل چوکیدار کے پاس چھوڑے (یہ چوکیدار چچا کی دریافتوں میں سے ایک تھا) جب وہ کافی پی کر نیچے اترے تو چوکیدار غائب ہو چکا تھا ــــ ان کی سائیکلوں سمیت انھوں نے بڑا ہنگامہ مچایا۔ چچا عبدالباقی اور مجھ کو الزام دیا کہ ہم نے خود چوری کروائی ہے۔ . . . تھوڑی دیر کے بعد کچھ پولیس مین ہاتھوں میں نوٹ بکیں لئے ہوئے آئے اور میرے اور چچا کے پتے اور دیگر تفصیلی سوانح عمریاں نوٹ کرنے لگے

میرے دو ہزار روپے میں سے بارہ سو روپے بدرو میں جا چکا تھا (چار سو تو افتتاحیہ ڈسے ہی کی نذر ہو گیا) چچا عبدالباقی کی بشاشت بدستور قائم تھی، مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ آپ کا کافی ہاؤس کے معاملات ایک بحران میں پہنچ رہے ہیں اور میں آخری خاتمہ کا انتظار کر رہا تھا۔

⑨

آپکا کافی ہاؤس کو وجود میں آئے بارھواں دن تھا۔ شام کے کوئی چھ بجے ہوں گے اور میں کاؤنٹر کے سٹول

پر بیٹھا بوڑھے آدمی کو خط لکھ رہا تھا کہ میرا بزنس خوب کامیاب جا رہا ہے مگر اس کو بالکل مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے فقط ایک ہزار روپے اور درکار ہوگا۔ چچا عبدالباقی اوپر اپنے آفس میں تھا۔ گاہک کوئی نہ تھا۔ ہاں ہمارے تین ملازم انٹلیکچوئل نوجوان اوپر کافی روم میں بیٹھے فرائڈ جمیز جوائس وغیرہ پر بحث کر رہے تھے۔ دو بیرے اوپر کافی روم میں تھے۔ تیسرا غالباً نیچے باورچی خانے میں سو رہا تھا۔

مجھے بازار سے دو آدمی کافی ہاؤس کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے پہلے سمجھا کہ آخر کچھ گاہک آئے لیکن ان کے بشرے اور حلیے کافی پینے والوں سے مختلف تھے۔ ان میں سے ایک تو وہی باریک مونچھوں اور کیل دار فل بوٹوں والا باقر کا بھانجا تھا، اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں کے روبرو اندھیرا سا چھانے لگا، دوسرا ایک خشخشی داڑھی والا خشمگیں قسم کا آدمی تھا جو اپنے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا کینوس کا بیگ پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے میں ایک لوٹا وہ غالباً سیدھا ریلوے اسٹیشن سے آرہا تھا ان کے پیچھے ایک موٹی برقعہ پوش خاتون بھی تھی جو ایک سات سالہ ناخوشگوار لڑکے کا بازو پکڑے ہوئے تھی جیسے اسے روک رہی ہو، مجھے یہ قیاس لگانے میں دیر نہ لگی کہ خشخشی داڑھی والا شخص باقر قیمہ سٹور کا پروپرائٹر محمد باقر ہے اور برقعہ پوش خاتون اس کی زوجہ حیات ناخوشگوار منہ والا بچہ یقیناً اس مبارک جوڑے کا لاڈلا بیٹا تھا، محمد باقر اور اس کے اہل و عیال نے اسٹیشن سے اترتے ہی ادھر کا رخ کیا تھا۔

خطرے کو پا کر میں سوچ ہی رہا تھا کہ اوپر بھاگ کر چچا عبدالباقی کے آفس میں پناہ کا طالب ہوں کہ وہ سب (عبدالغفور لانڈری ورکس کا پروپرائٹر بھی اب آستین چڑھائے ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا) ڈبل فائل میں طوفانی حملہ کی نیت سے دوکان کی طرف بڑھنے لگے، ہراول میں محمد باقر، اس کا بھانجا اور عبدالغفور تھے۔ ان کے پیچھے برقعہ پوش خاتون اور وہ کمینہ فطرت لونڈا تھا، وہ ایک جرمن ٹینکی دستے کی طرح بڑھ رہے تھے اور ان کا ارادہ دوکان کو ایک برق آسا پہلے حملے میں فتح کرنے کا تھا۔

بھاگنے کا وقت نہ تھا، میں نے جلدی سے ایک بیرے کے ہاتھ اوپر آفس میں چچا عبدالباقی کو ایس۔ او۔ ایس بھیجا میں۔ ابھی ایس او ایس بھیج کر فارغ ہی ہوا تھا کہ مجھے اپنا گلا کچھ کچھ گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے اشیا، کچھ دھندلی ہو رہی تھیں اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسا میری آنکھوں کا فوکس خراب ہو گیا ہو۔ ان کو فوکس کرنے کے بعد میں نے اپنے سامنے باقر کے بھانجے کو کھڑا دیکھا . . . اس کا ہاتھ میری نکٹائی پر تھا اور وہ اسے غصے میں کھینچ رہا تھا، سنا ہے۔ لو ابزادے " وہ کہہ رہا تھا " باہر نکل یہاں سے۔ کہاں ہے وہ تیرا اگولا سا منیجنگ ڈائرکٹر—— چار سو بیس" میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر گلے کے گھٹنے کی وجہ سے میری آواز غرغراہٹ بن کر رہ گئی . . . .

میرے اردگرد ایک محشر کا سا ہنگامہ بپا تھا، لانڈری ورکس والا عبدالغفور بیروں کو دھکے مار مار کر باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا باقر اپنے لوٹے کو دھمکانے کے انداز میں اپنے اوپر گھما رہا تھا، برقعہ پوش خاتون پیچھے سے مسلح ادھر ادھر ایک ہٹیلے ببر شیر کی طرح دندنا رہی تھی، باقر کا لونڈا باورچی خانہ میں گھسا ہوا اپنی جیبیں کیکوں اور کیسٹونٹوں سے ٹھونس رہا تھا۔ ان واقعات کی پوری تفصیل دینا ممکن نہیں، دو تین کرسیاں ہوا میں اڑتی ہوئی میرے پاس سے سفر کرتی ہوئی بازار میں جا گریں۔ ظاہراً مجھے پریشان نہ کیا گیا تھا۔

پھر چچا عبدالباقی کی آواز آئی۔ وہ اوپر سے اتر آیا تھا، وقار اور مرد حوصلے کی پوری تصویر۔
"یہ کیا حرکت ہے" اس نے حاکمانہ لہجے میں پوچھا " بختیار پولیس کو فون کرو۔"

"میں اس حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ اول تو فون ہی نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو اپنی اس موجودہ حالت میں جبکہ باقر کے بھانجے نے ابھی میری نکٹائی کو نہ چھوڑا تھا یہ قطعی نا ممکن تھا۔

چچا عبد الباقی نے اب باقر کو پہچانا۔

"بھئی باقر، بات تو سنو۔ مجھے سمجھا تو لینے دو، یوں دوکان کے مال کا نقصان نہ کرو"

برقعہ پوش خاتون چچا عبد الباقی کو بے ایمان۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے لگی، اس نے اپنے چھجے کو ایک غضبناک انداز میں چچا کے سر پہ لہرایا۔ باقر نے چچا کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا جیسے کہ اسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ باقر کا بھانجا آخر میری ٹائی کو چھوڑ کر چچا کی طرف لپکا۔

محمد باقر نے کہا "عبد الباقی تم تو سخت بے ایمان آدمی ہو۔ اچھا میں تمہیں دوکان سونپ گیا، کہاں ہیں میرے قمیضے اور کمبل ڈھائی تین ہزار کا مال۔"

چچا عبد الباقی نے اسے سمجھانے اور اسکے غصے کو دھیما کرنے کی کوشش کی، اس نے اسے یہ بھی خوشخبری دی کہ اس کا کافی ہاؤس میں ایک تہائی کا حصہ ہے۔ جس پر محمد باقر نے کہا "کافی ہاؤس کی ایسی تیسی" اس نے کافی ہاؤس اور ہمارے متعلق اور بھی ایسے کلمات کہے جنہیں چھاپا نہیں جا سکتا۔

"اچھا میرا ڈھائی تین ہزار کا مال کہاں ہے"۔ محمد باقر نے پوچھا

چچا عبد الباقی نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے اور اپنے چٹکلوں میں سے خوش طبعی کو منتشر کرتے ہوئے کہا۔

"فروخت ہو گیا"

"فروخت ہو گیا۔ سارا مال"۔ محمد باقر گرجا۔

چچا نے میری طرف اشارہ کیا "میاں بختیار نے تمہارا مال چند ہی دن ہوئے فروخت کر دیا۔ اس کی ہمت ہے۔ تمہاری دوکان میں تو یہ ایک سال سے پڑا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ فروخت پر دس فیصدی کمیشن چارج کریں گے۔ اگر تمہاری مرضی نہ ہوئی تو نہ کرینگے۔ بھئی بختیار محمد باقر کے مال کے پنتیالیس روپے آٹھ آنے ان کے حوالے کرو"

"پنتیالیس روپیہ آٹھ آنہ"، باقر چلایا، "میرا ڈھائی ہزار کا مال"

اس نے میری طرف دیکھا "بچہ میں تمہارے فرشتوں سے بھی تین ہزار وصول کروں گا، بھانجے ذرا اس پنتیالیس روپے میں میرا مال بیچنے والے کو ٹائی سے کھینچ کر باہر تو نکال، ذرا اس کی شکل تو اچھی طرح دیکھیں"

چچا عبد الباقی اور میری باقر کے بھانجے اور عبد الغفور کے ہاتھوں جو درگت بنی اور جو غیر شائستہ سلوک ہمارے ساتھ کیا گیا اس کا ذکر یہاں کرنا میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ چچا کی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹا، میرے اپنے دو دانت شہید ہوئے، ہم دونوں کو اوپر آفس میں چار گھنٹے محبوس رکھا گیا۔ . . بڑی مشکل سے ایک اقرار نامہ پر دستخط کرنے کے بعد کہ ہم محمد باقر کو اس کی دوکان پر ناجائز قبضہ کرنے کے عوض ہرجانہ کے طور پر ڈیڑھ ہزار روپیہ دینگے اور یہاں سے اپنی کوئی چیز (از قسم فرنیچر وغیرہ) نہیں لے جائیں گے ہماری جان چھوٹی ہم نے کافی ہاؤس کو خیرباد کہا۔

باقر نے اپنی اس رقم کی پائی پائی وصول کی، اور میرا والد کو یہ رقم ادا کرنا پڑی اسکے بعد عرصہ تک مجھ سے ناراض رہا۔

اگلے روز جب میں چچا عبد الباقی سے ملنے گیا تو اسکی عینک میں نیا شیشہ تھا۔ "بیٹھو بختیار۔ میں تم سے ایک ضروری معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں اس دفعہ تو ہمارا کاروبار چل پڑا تھا، گاہک بھی ایک دو دن میں آنے لگتے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم ٹھیک لائنز پر کام کر رہے تھے، محمد باقر نے اپنے نامعقول رویہ سے ہمیں سخت نقصان پہنچایا، خیر اس کو چھوڑو۔ میں تم سے پھر ایک ضروری معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں . . . . . "

اُمنڈتا سمندر — اُبھرتا جزیرہ

انور عظیم

اور پھر ڈھولک کی لہراتی ہوئی زہریلی جھوم جھوم تھاپ۔ ۔ ۔
ماں کی تھپکیاں بچے کو نیند کی وادی میں پہنچا دیتی ہیں۔ لیکن اُبٹن، مہندی اور عطر میں بسی ہوئی ڈھولک کی
تھپکیاں کس طرح میری نیند اُڑا لے گئی ہیں۔ اور میرے ذہن کے آئینہ خانے میں اَن گنت ننھے منے سوز نوں اور دریچوں سے
کتنے معصوم خواب، کتنی کنواری ہوئی آرزوئیں کافور اور لوبان کی خوشبو سے معطر در آئی ہیں — میں تو ڈر گئی ہوں، سہم گئی
ہوں، لرز گئی ہوں — اوہ!

اوہ تم — تم یہاں کیسے نازل ہو گئے — ارے تمہاری آنکھیں اب بھی ویسی ہی گمبھیر، گہری اور چمکیلی ہیں۔ رات کے
اندھیروں کی لکیریں اب بھی بے چین ہیں۔ زعفران کے پھول کی طرح۔ لیکن تم کس نشے میں ہو۔ تم بھالے کی طرح نم
میرے ذہن کی قبر چیر کر نکل آئے ہو۔ پھر تمہارے بھرپور مردانہ لبوں پہ ایسا جابنازطنز سے بھرا ہوا تبسم کیوں ہے۔ اوہ تم مجھ پر
جھکے آ رہے ہو۔ تمہاری جان کی قسم میں ڈر جاؤں گی۔ دیکھو میں پسینے سے شرابور ہو گئی ہوں۔ ہاں بس، یہیں کرسی پر
بیٹھ جاؤ، شرافت سے آدمی کی طرح، میری سانسوں میں کیا ادھم مچا دی تم نے، خدا سمجھے تم سے۔

تھپ تھپک تھپک — ارے یہ تو شادی کی ڈھولک ہے، ہا ہا ہا — تم تو واقعی کسی قبر سے نکل کر
آ رہے ہو، تم رفیقہ کو تو جانتے ہی ہو، میری جان سے زیادہ عزیز سہیلی، ہاں اسی کی شادی ہو رہی ہے۔ کس سے۔ اسی
تمہارے رقیب سے، غلط، خود ساختہ رقیب سے، خدا کی قسم تم تو جانتے ہی ہو، میں تو اس کی اکیسویں محبوبہ تھی، یا میں
اس کی اکیسویں نظم تھی (حالانکہ ابھی وہ ایک مبتدی ہے اور مشکل سے اس نے دو تین نظمیں کہی ہیں) یا اکیسواں
رومان یا اس کے تصور کا اکیسواں تاج محل — اور تم، دراصل تم ہی میری زندگی کا محور۔ ۔ ۔ خیر چھوڑو، تم نازل
کس طرح ہو گئے یہاں، یا میرے اللہ —

ہاں میں شادی میں گئی تھی، ضرور، پر بھاگ آئی۔ دم گھٹنے لگا تھا میرا، مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ میری سہیلی بٹیا بنی بیٹھی تھی، پیلے
کپڑوں میں پہلی بچی جیسی معصوم کلی، حنا اور اُبٹن کی لپٹوں میں رچی بسی۔ آنکھوں میں کتنے خواب تھے اس کی۔ کچھ اُبھرے
ہوئے، کچھ ڈوبتے ہوئے، — کشتی کی طرح ڈوبتے ہوئے، جزیرے کی طرح اُبھرتے ہوئے۔ اور میرے سینے
میں ایک سمندر کھولنے لگا۔ میں بھاگ آئی۔ اور تم جانو درد کا بہانہ کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

میں نے دروازہ بند کر لیا ہے۔ دونوں دروازے بند ہیں۔ دوسرے میں کھلنے والا دروازہ اور وہ سامنے والا
دروازہ بھی جو سامنے والے لمبے سائبان میں کھلتا ہے وہی سائبان جہاں سنگھر مشین کے پاس بیٹھ کر تم چھوٹی سی میز پر
مجھے انگریزی، اردو، جغرافیہ اور ریاضیات وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح مقید کر لیا ہے۔
پھر بھی تم اندر گھس آئے ہو۔ میں تو حیران ہوں۔ میں تو بہت تھکی ہوں اور تم اسی طرح مسکرا رہے ہو۔ کتنے
قاتل ہو تم۔ میں پوچھتی ہوں تم آئے ہی کیوں۔ اس وقت رات کے سناٹے میں دنیا سے رشتہ توڑ کر اس کمرے میں

بند ہو گئی ہوں تم نے آکر میرا رشتہ دنیا سے کتنا گہرا کر دیا ہے۔ بتاؤ اس سے تمہیں کیا مل جائے گا۔ میرا دل تو خون ہوا جا رہا ہے اور تم مزے میں پائپ اڑا رہے ہو۔ پلک بھی نہیں جھپکتی۔ تو تم پھر پائپ پینے لگے۔ تم سے لے کر میں نے پائپ کو پھینک دیا تھا اور تم نے اس کے بعد تمباکو کا استعمال بند کر دیا تھا۔ لیکن اب پھر تمہاری وحشتیں تازہ ہو گئی ہیں تو یوں کہو ۔۔۔ اب؟

دیکھو کہتی ہوں، میرے پلنگ پر نہ او، بہت برا ہو گا، میں تمہارے لئے حرام ہوں۔ خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو مجھے نہ ستاؤ۔ دیکھو اس روزن سے اب تک اندھیرے کا کفن اوڑھے ہوئے گیت ہیں کہ اڑے چلے آ رہے ہیں۔ یہ گیت سانپ کی طرح مجھے ڈس رہے ہیں۔ کیوں۔ ہاں رفیقہ میری سہیلی ہی تو ہے۔ جگری سہیلی ہے نا۔ پھر بھی ایسے وقت میں اپنا مستقبل کیسے بھول سکتی ہوں۔ میرا مستقبل کیا بھیانک ہو گیا ہے۔ اتھاہ اندھیرے میں کھوئے ہوئے گہری طرح۔ اب میں کبھی پا سکوں گی اپنی زندگی کو، اپنے مستقبل کو۔ چھوڑ دو مجھے۔ کیوں تھکے آ رہے ہو اس طرح۔ میں چیخ ماروں گی۔ میں کہتی ہوں انور ۔۔۔ میں بہت بدل گئی ہوں۔ میں اس ماسوا کا تضاد ہوں جو تجدید صندل کی شاخ کی طرح اپنا منہ تمہاری گردن اور بازوؤں میں چھپا دیتی ہے۔ جو اپنی زلفوں کو تمہارے مسکراتے ہوئے چہرے پر ریشمی اور عنبریں جال کی طرح پھیلا دیتی تھی۔ اور ان کالے مخملیں جالوں میں چمکتی ہوئی آنکھیں تمہیں دو ننھی ننھی چاندی کی شبنم میں ڈوبی ہوئی مچھلیاں نظر آتی ہیں ۔۔۔ اور تم زلفوں کی بدلیوں کو چیر کر میرے گلاب کی پنکھڑی کی طرح پتلے اور رسیلے ہونٹوں کو چوم لیتے تھے، چومتے چلے جاتے تھے، میری آنکھیں میری جبیں، میری پیشانی پر بائیں طرف کی زلف کی سرحد پر ایک پاسبان کی طرح کالا مسہ۔ اس وقت تم دیوانے ہو جاتے تھے نا۔ لیکن اب دیوانگی مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں بدل گئی ہوں، انور ہوش میں آؤ۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ میں تو تم سے نفرت کرتی ہوں۔ کیا میرے بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا نے تم سے نہیں کہا، ضرور کہا ہو گا۔ لیکن تم ٹھہرے ایک رومیو، کب یقین آنے لگا بھلا۔ اوہو بھلا تمہاری ماسو تمہاری پرستار ہمیشہ ہی تو رہے گی۔ لیکن سچ کہتی ہوں اب بھی لٹنے سے نکلو۔ واقعہ یہ ہے کہ تم دھوکے میں رہے ہو۔ ہائے ۔۔۔ تم مسکرا رہے ہو۔ تمہیں میرے منہ سے یہ سنکر بیہوش ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن تم نے تو اپنے ذہن کو صنم خانہ بنا رکھا ہے وفا کا بت استادہ ہے اب تک ہائیں ۔۔۔؟ دیکھو ابھی آن کی آن میں اس بت کو ایک ہی جھٹکے سے آپ توڑ کر رکھ دیتی ہوں ۔۔۔ ہا ہا ۔۔۔ بت بت ۔۔۔ اور تم بے شرم کہیں کے قہقہہ لگا رہے ہو، مہیب گیدڑ کی سی آواز ۔۔۔ اللہ میرے۔

تم سمجھتے ہو تمہاری مسکراہٹ ایک جوہری چھری ہے اور تم مجھے انتقاماً اس زہر میں بجھی ہوئی چھری سے آہستہ آہستہ اذیت پہنچا کر ذبح کر دو گے ۔۔۔ لیکن جب تم میری اس چھوٹی سی کچی جھوٹی مجرد دنیا میں گھس پڑے ہو تو میں بھی تم سے باتیں کروں گی۔ میں آج کی رات حساب چکاؤں گی تم سے۔ اور پھر میں دیکھوں گی کون قتل ہوا اور کون اپنے ہاتھ کو خون سے رنگ گیا۔ کس کی روح میں خزاں سلگ اٹھی اور کس کی دنیا میں بہاروں کا قافلہ ٹھہر گیا ۔۔۔ تم ناکام رہو گے۔ میں تمہارے خون سے اپنا ہاتھ رنگوں گی۔ پھر کیسی خنا سجے گی ان حسین، کومل، نرم اور نمکین ہاتھوں میں اس۔ رفیقہ کے ہاتھوں کی مہندی بھی ماند پڑ جائے گی، ہائے میری معصوم سہیلی، پیاری، جگری سہیلی۔ میں تری شادی میں بھی نہ ٹھہر سکی۔ میں بھاگ آئی، اس چھوٹے سے کمرے میں۔ یہاں جہاں ایک پلنگ ہے اور سامنے بڑا سا آئینہ جھکا ہوا ہے۔ جیسے ابھی باہیں پھیلا کر مجھ پر چھا جائے گا۔ اور وہ دو چھوٹی الماریاں جن میں کتابیں اور رسائل ٹھسے ہوئے ہیں۔ اور مدھم سی لالٹین چڑیل کے قہقہے کی طرح سسکیاں لے رہی ہے۔ اس کی لو تکے جا رہی ہے مجھے۔ ہول ۔۔۔

میرا مذاق اڑا رہی ہے شاید، اپنی لال پیلی زبان نکال کر میرا منہ چڑا رہی ہے، چڑیل ــــ اے میری رفیقہ نکل اس شادی کے ہنگامے سے۔ کیا تو دیکھنا نہیں چاہتی اس معرکہ آرائی میں کون ہارتا ہے، کون جیتتا ہے ــــ میں میں میں ــــ صرف میں جیتوں گی کہے دیتی ہوں ــــ تو بھی میری خوش نصیب سہیلی، میری رفیقہ سُن لے، انور آگیا ہے۔ اس قید خانے میں ــــ ہاں وہ آگیا ہے۔ میرا قاتل آگیا ہے۔ کواڑ میں نے بند کر لئے تھے، لیکن مسجد کی طرف والے روزن سے شاید آگیا ہے وہ۔ یا شاید دیواروں سے پھوٹ پڑا ہے وہ ــ اب میں کیا جانتی تھی کہ وہ سینکڑوں میل دور سے اس طرح مجھے تنہا پاکر یہاں چلا آئے گا؟ گھر میں تو سناٹا ہے، سب تیری شادی میں گئے ہوئے ہیں نا؟ پورا گاؤں گونج رہا ہے۔ تیرے اُبٹن اور سہاگ بڑھنے نے پورے گاؤں کو ایک خیابان کی طرح لہلہا دیا ہے۔ یہ کیسا خیابان ہے، کہیں زعفران، کہیں ختن کرمری۔ روح میں چیونٹیاں لپٹ گئی ہیں، میری ایک ایک سانس کانٹوں کا کارواں بن گئی ہے۔ اور یہ کمرہ میرے لئے ایک مہلک سازش بن گیا ہے، اس کی دیواریں پھٹ پڑی ہیں اور ہر دیوار سے جیتا جاگتا انور نکلا چلا آ رہا ہے۔ تو جانتی ہے۔ میں نے اس کو ماضی کی قبر میں ڈال دیا تھا۔ لیکن تو کیسے جان سکتی ہے جبکہ تیرے کلکتہ سے آنے پر رات بھر تیرے سینے سے لپٹ کر تجھے آنسو بہا بہا کر یقین دلاتی رہی کہ انور کمینہ اور لوفر ہے۔ میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی) مگر وہ تو یہاں موجود ہے، وہ دیکھ، اپنے سہرے کی رنگین لڑیوں سے باہر دیکھ۔ گیت گاتی ہوئی عورتوں سبز و سرخ لباسوں کے جنگل سے نکل اور یہاں میری خون گشتہ تنہائی میں جھانک اور دیکھ، وہ قبر سے نکلا ہوا انور کتنا جیالا نظر آ رہا ہے۔ کس طرح وہ شان کبریائی سے سامنے کرسی پہ ڈٹ گیا ہے، دانتوں میں اس نے اپنی تلخ دھوئیں سے بھری ہوئی پائپ دبا رکھی ہے اور پھک پھک دھوئیں کے گولے باہر پھینک رہا ہے، مزے میں منہ بنا بنا کر مٹیالے دھوئیں کی زنجیریں ہوا میں سرمئی جھالر کی طرح اڑ رہی ہیں زنجیر کی طرح بج رہی ہیں، زنجیر کی طرح پگھل رہی ہیں ــــ کاش یہ انور کا پیکر بھی دھوئیں کی ان ہی زنجیروں کی طرح پگھل جاتا، شہتیروں سے ٹکرا کر فنا ہو جاتا، میری یادوں کی طرح مصلوب ہو کر رہ جاتا لیکن وہ تو اس طرح آ کر بیٹھ گیا۔ جیسے یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔ اس کے بال زنجیر در زنجیر اس کی ابروؤں کی دونوں جانب جھک گئے ہیں۔ اس کی عنابی آنکھوں در لفظوں میں باغیانہ روایتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کا سفید ہوائی شرٹ اس کے سانولے جسم پر اچھا کھل رہا ہے۔ گریبان کے بٹن کھلے ہوئے ہیں اور اس کی بھری بھری چھاتی پر چپکی ہوئی بنیائن میلی میلی نظر آ رہی ہے۔ وہ کبھی آئینے کو دیکھتا ہے۔ کبھی الماریوں کو، کبھی دیواروں کو جن سے بھٹک کر وہ یہاں آگیا ہے معلوم ہوتا ہے یہ دیواریں ماں کی طرح اسے گھور رہی ہیں، اور مجھے کوفت ہو رہی ہے، غصہ آ رہا ہے گھٹن ہو رہی ہے، اس کمینے نے میری آنکھوں میں مرچوں کی جھالنس سے بھرا ہوا دھواں بھر دیا ہے۔ میں رو دوں گی، میں چیخ پڑوں گی ــــ لیکن تجھے کیا پڑا اے میری جگری سہیلی ــــ رفیقہ تو تو سہاگ کے نشے میں بدمست ہے تو تو تھوڑی دیر میں اپنے سہاگ کی خلوت میں ہوگی، تیرا کم عمر شاعر تیرے پلنگ پر پھیلے ہوئے آئے گا، تو سمٹی ہوئی گلابی دوپٹے میں بیٹھی ہوگی، تیری سانسیں اچھل اچھل رہی ہوں گی، تیرے سانسوں سے اُبٹن، عطر اور حنا، جوانی اور آرزوؤں کا گلستاں پچکاری سے نکلے ہوئے رنگین پانی کی طرح نکلے گا اور تیرے شاعر پر ایسی عطر فشانی کرے گا کہ وہ بیچارہ بولا جائے گا ــــ وہ آہستہ سے تیرا دوپٹہ سرکائے گا تیرا کھلا ہوا چہرہ دیکھے گا، تیرا دھیما دھیما صندلی رنگ، زرد زرد رنگ میں نیند کا نشہ اور بیداری کی ترنگ گھلی ہوگی، میٹھی میٹھی میٹھی ترنگ، نمکین نمکین بھینی بھینی ــــ تیری آنکھیں کھل جائیں گی۔ اور تیرے شاعر کی آنکھوں میں زندگی کا افق، بجلیوں کے کوندوں سے جل اٹھے گا اور دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے آرزوؤں اور خواہشوں کی

کتنی چغلیاں کھائیں گی ـــــ اور پھر ایسے میں میری بدنصیبی کا گہن تیرے لئے بھلا کیا دلکشی رکھتا ہے۔ ہاں مجھے بیٹنے نے تنہا، مرنے کے لئے چھوڑا ہے۔

انور ـــــ تم مجھے تنہا نہیں چھوڑو گے؟ اوہ کیسی خوفناک رات ہے؟ تم چلے جاؤ، اللہ میرے ـــــ ہاں مجھ پر رحم نہیں آتا، میں کتنی معصوم ہوں، کتنی مظلوم۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو چلے جاؤ انور، چلے جاؤ ـــــ یوں نہ مسکراؤ۔ یہ زہریلی مسکراہٹ نہ بکھیرو۔ میری زندگی میں زہر کا قحط نہیں۔ طنز اور تنفر کے نشتروں کو میری زندگی میں کیوں بوتے ہو۔ کون سی محبت کی حسین فصل کاٹ لوگے اس کے بعد، یہ سب بیکار ہی تو ہے۔ میں تم سے کٹ گئی ہوں، تم مجھ سے چھوٹ چکے ہو۔ میں تم کو بھول چکی ہوں۔ اب تو میں تم سے نفرت کرتی ہوں، تم نے میرا مستقبل تباہ کر دیا ہے تم ایک آوارہ اور کمینے انسان ہو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑا، لیکن میں تو کہیں کی نہیں رہی، میں ایک زمیندار کی لڑکی، لاکھوں کی زمینداری جس کے قدموں پر۔ جس کے سینکڑوں بیگھ کھیت کتنے گاؤں۔ کتنے کنبے ـــ اوہ کس طرح تباہ ہو گئی میں۔ بدنام ہو گئی۔ میری داستان رسوائی مجھے کھا گئی۔ میری جوانی کو، میرے سپنوں کو، میری جوانی کو ـــــ اور پھر بھی تم پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جاؤ ان دیواروں میں سما جاؤ۔ یہ دیواریں تمہاری ماں ہی تو ہیں۔ تم اس دیوار میں چھپ جاؤ۔ تمہیں میرے پاس آنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے ـــ (نہیں تو تم جانتے ہو کہ میرے بڑے بھیا، جلو کی مورت بھیا، تمہارے دوست کمیع آرٹسٹ کو پٹنہ لان میں بٹھا کر یہ اچھی طرح سمجھا چکے ہیں کہ وہ تمہاری سیاسی سرگرمیوں کو بہانہ بنا کر ڈی آئی۔ جی سی آئی ڈی کے ذریعہ زنداں میں لوا دیں گے ..... اور تم پھر مسکرا رہے ہو جیسے ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو بھی سرکار کی بجائے بھیا کی زمینداری سے تنخواہ ملتی ہے اور جیسے تمہاری سرگرمیوں سے حکومت بے خبر ہے ـــــ؟ میں سمجھتی ہوں تم اسے محض حماقت سمجھتے ہو اور سچ پوچھو تو بھیا ہیں بھی بڑے احمق) اچھا اب جاؤ۔ بھاگو یہاں سے، جاؤ بھاگو ـــــ

ہاں مجھ پر تمہارے اس زہر آلود تبسم کا جادو نہیں چلے گا ـــ

اور یادیں ـــــ ذہن کے یہ بوسیدہ مہیز ـــــ؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم۔ ہاں مجھے سب یاد ہے پہلی بار جب میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھا تھا یاد ہے تم ان دنوں سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر روپوش تھے۔ اور پولیس تمہیں گرفتار کرنے کے لئے بے چین تھی۔ میں نے تمہارے بارے میں سن رکھا تھا۔ کچھ تمہاری آوارگی کی باتیں۔ تم جلسہ اور جلوس کے لئے جان دیتے تھے اور اس کے لئے تمہاری جان پر بن جاتی تھی، تم انچاس کے جون میں آئے تھے۔ جب تم نیم روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے، میں سیاسی باتیں کیا سمجھتی۔ البتہ ایک روز معلوم ہوا کہ تم آؤ گے۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ تم کیسے ہو، تم جو ایک ادیب تھے، ایک ذہین مقرر، اور خطرناک طور پر عملی انسان، جانتے ہی ہو ہم متوسط گھرانوں کی لڑکیاں سیاسی لوگوں کو کتنا بڑا ہیرو سمجھتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی ان کے اندر ہیرو درشپ کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ تمہارے آنے سے پہلے میرے دل میں تمہارے لئے کیا کچھ تھا۔ تم بھی اجنبی تھے۔ دل کا جذبہ بھی اجنبی تھا۔

صبح کا وقت تھا جون کی بارش کے پہلے چھینٹوں سے دھلی ہوئی چمکیلی دھوپ کھپریل پر چاندی کی رقیق جھلی کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ بڑے بھیا اپنی نئی نویلی معطر دلہن کے ساتھ اوپر کے کمرے میں تھے۔ میں باورچی خانہ میں ان کے ناشتے کا مرحلہ طے کر رہی تھی۔ کچوریاں کڑاہی میں تھیں۔ گھی کی خوشبو شہد کی مکھیوں کی طرح اڑ رہی تھی۔ اماں بہو کے ناشتے پر چیخ چلا رہی تھیں۔ چھوٹے بھیا دوڑتے ہوئے اندر آئے اور اوپر زینے پر بھاگتے ہوئے دہیں سے چیخ ماری ......

"ار بھیا ـــــ انور بھائی آ گئے"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ دیکھوں، آگئے آگئے ـــــ اور جب میں ناشتہ بھیج کر، چھوٹے چھوٹے کاموں سے نمٹ کر اوپر پہنچی تو تم بھیا کی خلوت میں تھے۔ تم ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے سنگار میز کی طرف تمہاری پشت تھی بھیا گراموفون بجا رہے تھے ـــــ کیا تھا وہ گانا ـــــ "آنچل میں کیوں باندھ لیا مجھ پردیسی کا پیار ـــــ" میں نے تمہیں سلام کیا اور مسہری پر بھابی کے پاس بیٹھ گئی۔ بھیا بھی اسی مسہری پر تھے۔ بھابی نے اپنا ساٹن کا سبز جوڑا پہن رکھا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی چپڑی ہوئی تھی، وہ بالکل طوطا معلوم ہو رہی تھیں اور تم تو ان کی آنکھوں کا زلزلہ بھی دیکھ رہے تھے اور یقیناً وہ تمہیں اس طرح طوطا چشم بھی نظر آ رہی ہوں گی۔ اور نازک سی پھول کی پتی کے متصل بھیا گوشت کے تودے کی طرح ہل رہے تھے ـــــ ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ لوشن کبوتر معلوم ہو رہی تھی۔ کتنا نہال تھے وہ۔ پھر ریکارڈ بجنا بند ہو گیا۔ تم اس وقت بتا رہے تھے کس طرح پولیس نے تمہارے مکان کو گھیر لیا تھا۔ تم اس وقت ہر طرف سے گھر گئے تھے۔ تم مکان کی دوسری منزل پر چلے گئے تھے۔ مکان زنانہ تھا اور ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ پولیس مکان میں داخل ہو گئی تم مکان کے پچھلے حصے پر چلے آئے۔ دیوار کے اس پار گرلز اسکول کا باغ تھا درمیان سے ایک دلدل سے بھرا ہوا نالہ بہتا تھا۔ جس کے اس کنارے پر گرلز اسکول کے باغ کی نالی کی چہار دیواری تھی ـــــ اور اس سے آگے امرود، گرینڈ فروٹ، شریفے، پپیتے اور املتاس کے گھنے گھنے پیڑ تھے۔ تم نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ سیڑھیوں پر چمکتی ہوئی تشنہ خون سنگینیں نظر آئیں اور تم دھم سے بلندی سے کود گئے۔ دو دائن کرتی ہوئی لڑکیوں نے چیخنا چاہا۔ لیکن تم نے انہیں ڈانٹ کر چپ کر دیا۔ وہ سکتے میں آ گئیں اور پھر تم اطمینان سے شہر کوتوال کی طرح ٹہلتے ہوئے سڑک پہ آئے، ندی کی طرف گئے اور پھر ندی پار کر گئے اور دوسرے کناروں پر دو میل چل کر شہر میں واپس آ گئے ـــــ سچ کہتی ہوں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں کوئی فلم دیکھ رہی ہوں ـــــ پھر تم نے بھیا کے اصرار پر اختر پیامی کی ایک نظم سنائی ـــــ

"میں شاعر نہیں ـــــ البتہ اس طرح شاعروں کا ریکارڈ ضرور بن جاؤں گی ـــــ"

تمہاری طراری، گمبھیرتا۔ نظروں کی شدت، باتوں کی بے پروائی، تیکھا پن طنز، مزاح، زندہ دلی، علمی بحثیں۔ ایک وسیع اور گہری دنیا، امکانات سے بھری ہوئی کہکشاں بن کر تم ابھرے، اور پھر آسمان کی طرح افق تا افق چھا گئے۔

تم سات دن میرے مکان میں مقیم رہے۔ اس کے بعد چلے گئے وہ سات دن میرے تمہارے درمیان سات زینوں کی حیثیت رکھتے ہیں، تم سات زینوں کے اوپر کھڑے تھے اور میں ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ ایک زینہ اوپر اٹھ جاتی تھی یہاں تک کہ میں تم سے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اور تمہیں دیکھتی رہی۔ نہیں جانتی تم بھی مجھے دیکھ رہے تھے کہ نہیں۔ تمہارا سانولا چہرہ۔ تمہارے الجھے الجھے جنگلی بال، تمہارے وزنی مسکراتے لب تمہاری ہمیشہ سوچتی ہوئی، اور قہقہہ لگاتی ہوئی آنکھیں، بھیا سے تمہاری بحثیں، بھابی کی کھوکھلی بورژوا ملمع پر تمہاری گفتگو ہوتی چوٹیں تیز طنز ـــــ پنیر کے کیک کو کاٹتے ہوئے چاقو کی طرح تیز جملے ـــــ

"کیوں مولانا آپ نے کس کا خون پیا ہے ـــــ ویسے ہی آپ کے خوبصورت ہونٹ کیا کم زہریلے تھے ـــــ ایں؟"

اور پھیلنے، جو جھوٹ اور فریب کو معشوق کی طرح سنوارتے رہنے کے عادی تھے آپ کو بتایا تھا کہ بھابی تو انگریزی فرانسے سے پڑھتی تھیں، جیسے اسٹوڈی بیکر فراٹے بھرتی ہوئی چکنی سڑک پر چلتی ہے اور ان سے بند کمرے میں فیری ٹیکس والی انگریزی کتاب کا سیب اور سنگترہ کھا کھا کر ریہرسل کروائے۔ اور پھر اس کی نمائش ایک چاق

وجھنڈ بداری کی طرح تمہارے سامنے کرواتے، مسکراتے اور تالیاں لگاتے اور اپنی بُربُری مدہوش آنکھوں کو دوش میں لے آتے۔

"اوہ یہ تو مرے سے ہندوستانی معلوم ہی نہیں ہوتیں ۔۔۔ مولانا آپ کی سن پیدائش کیا ہے؟" اور بھابی بقول تمہارے مولانا بھابی جھینپ جاتیں۔ لپ اسٹک کے لیپ سے رنگے ہوئے لبوں کے پیچھے سے غیر ہموار دانتوں کی باڑھ چمک اٹھتی تھی اور چکنے گالوں میں کھنور ناچ اٹھتے تھے ۔۔۔

"دھت ۔۔۔ انور بھائی آپ بڑے وہ ہیں ۔۔۔ بناتے ہیں۔ میں خوب سمجھتی ہوں ۔۔۔" ان کا سر اِدھر اُدھر ڈولتا اور شہادت کی انگلی ہوا میں خراشیں کھینچے لگتی۔

اور واقعی جب تک تم یہاں رہے بھابی کے تصنعات کا چھلکا نوچتے رہے اور میں اس ماحول کی کھال ادھڑتی دیکھتی رہی، اور دیکھتی رہی کہ انڈے کے سفید خول کے اندر زردی اور سفیدی کس طرح جدا جدا ہیں۔ پہلی بار مجھے زندگی کا خون اور گوشت نظر آیا۔ جس طرح مرغی کی کھال ادھڑنے کے بعد اس کا چکنا اور بے جان گوشت دکھائی دیتا ہے۔ مرغی اس وقت مردہ ہوتی ہے۔ مگر میرے سامنے تو جیتی جاگتی حیات تھی۔ زیست کی تشنگی اور آرزوؤں کی گرسنگی تھی۔ سینہ چاک اور دل گداختہ، انسان کتنا متضاد ہے، کتنا سیاہ اور کتنا سپید۔ کتنا بلند اور کتنا پست، کتنا چھوٹا کتنا کمینہ اور کتنا باوفا۔ کتنا جانفروش ۔۔۔ لیکن در اصل اس وقت میں اتنا صاف صاف سمجھ نہیں سکی تھی ۔۔۔ اس لئے کہ اس وقت زندگی میری آنکھوں میں گدلی ندی کی طرح بہہ رہی تھی اور اب تو اس کو میں شیشے کی طرح صاف دیکھ رہی ہوں ۔۔۔

آٹھویں دن تم چلے گئے۔

میں تمہیں تمہارے چلے جانے کے بعد دیکھتی رہی۔ اس وقت جیسے میں ایک اونچے ٹیلے پر کھڑی ہو گئی تھی اور تمہیں دیکھ رہی تھی، مرغزار کو، بہتے ہوئے چشمے کو۔ سرسوں کے پیلے پھولوں سے بھرے خوشبودار کھیتوں کو، شفق کی شوخ میناکاری کو ۔۔۔ اور میں اسی طرح زندگی کے اونچے ٹیلے پر تنہا کھڑی تمہیں دیکھتی رہی اور دیکھتے دیکھتے تم ان ہی شفق زاروں میں کھو گئے جن سے نکل کر تم آئے تھے تم جگنلی تتلی کی طرح اڑ گئے اور میں ایک بیوقوف بچی کی طرح جیسے باہیں پھیلا کر اور مٹھیاں بھینچ کر بھاگتے بھاگتے تھک گئی ۔۔۔ لیکن یہ سب میں اب سوچتی ہوں۔ اس وقت میری سمجھ میں یہ سب کچھ نہ آیا تھا۔

تم کسی اخبار کے ایڈیٹر ہو کر اس کے بعد کلکتہ چلے گئے تھے نا۔ وہاں بھی تم اپنی سیاسی اور ادبی تحریک میں شریک تھے۔ اور ان دنوں کلکتہ میں روز ہی لاٹھیاں برستی تھیں، اشک آور بم پھٹتے تھے اور گولیاں چلتی تھیں اور تم لاٹھیوں کی بارش میں، اشک آور گیس کے زہر میں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں سینہ تان کر چل رہے تھے۔ تم کبھی ہنرو پارک میں تقریر کرتے اور کبھی محمد علی پارک میں مزدور نوجوان لیگ کے جلسے کی صدارت کرتے۔ تمہیں خطرات سے کتنا عشق تھا، کتنا پیار، کیسا جنون تھا تمہیں جیسے زندگی میں ان چیزوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ان ہنگاموں کے سوا اور کوئی رونق نہ تھی اور یہ سب میں چپکے چپکے سنتی رہی اِدھر اُدھر سے۔ یہ آوازیں میرے کانوں میں۔ میری روح میں اس حسینہ آواز کی طرح گونجتی رہیں جو جاڑے کی اندھیری اور مفلوج رات میں دور کہیں گرجا گھر سے آ رہی ہو، چھن چھن کر، ماتمی آہنگ کے ساتھ، سوگ مناتی ہوئی اس احساس سے میرا دم گھٹتا تھا ۔۔۔ مگر ۔۔۔ ہاں، ۔۔۔ ہاں، میں اس گونج کی حزنیہ اثر انگیزی سے گھبراتی تھی۔ اور اسے میں اپنی روح کے تاریک تہہ خانوں میں چھپا دیتی تھی جس طرح شادی سے پہلے پیدا

پھولنے والا بچہ قبر میں سلا دیا جاتا ہے۔

تمہارا چہرہ اتر کیوں گیا۔ آنکھوں میں آنسو کیوں بھر گئے ہیں۔ ابھی کلیجہ اور چھلنی ہوگا۔ ادھر او اب اپنے بھاری باوقار ہونٹوں کو چاٹنے بھی لگے۔ ہاں ہاں پائپ اٹھاؤ، سٹراک سٹراک۔ دم کیوں نکلا جارہا ہے۔ تم تو بڑے سورما ہو۔ عاشق جانباز ہو تم تو۔ سنو، سنتے جاؤ۔ میں سارا زہر تمہارے منہ پر تھوک رہی ہوں گی۔ تب شاید کہیں تمہارے دماغ کا خلل دور ہوگا۔ اچھا اتنے ہی میں کرسی پر نڈھال ہو کر ڈھلک گئے ـــ ہا ہا ہا ـــ سر میں درد ہونے لگا ہوگا بیچارے کے، ابھی تو بہت باقی ہے۔ ابھی تو رات کمر تک ہی اترے تھے، سنو، سنو، سنتے جاؤ، میرے پیارے کومل سانپ، میرے خوبصورت زہر۔ چونکو نہیں۔ چونکو نہیں ـــ ہاں بہت خوب بس اسی طرح پائپ پیئے ـــ مودیری اسمارٹ، دھواں اڑاؤ، ہاں ہاں اس طرح شکست کا بوجھ ہلکا ہونے لگتا ہے، تمہارے جیسے شہ زور ادیب، اور باشعور انسان کی آنکھوں میں یہ آنسو بالکل نہیں سجتے ـــ جسٹ آؤٹ۔ آف پلیس ـــ چچ چچ ـــ یہ تو میرا اجارہ ہیں۔ یہ میری دولت ہے، اسے میرے لئے رہنے دو۔ تمہیں تو دنیا میں بڑے بڑے کام کرنا ہیں۔

ہاں تو ـــ اس طرح ایک سال بیت گیا۔ میں اپنی چھوٹی باجی کے ساتھ بڑے پھاٹک کے پاس رانچی گئی ہوئی تھی۔ یہ پہاڑی چھوٹا سا شہر جاپانی کھلونے کی طرح نازک اور حسین تھا اور ہوا میں ایک جاندار گیند کی طرح معلق دکھائی دیتا تھا۔ جون کا مہینہ تھا اور ہمیشہ بادلوں کے جھولے اڑتے پھرتے نظر آتے تھے۔ کبھی سفید ہاتھی کی سینکڑوں سونڈیں جیسے، شامیانے، ٹپ ٹاپ لہر وقت لگی رہتی تھی۔ فضا نم تھی، دھوپ کا نکھار خواب کی طرح کھو گیا تھا۔ میرا دل لین اپنی چھوٹی باجی کی بچی سے خوب کھیلا کرتی تھی۔ وہ ایک ہی ماہ قبل پیدا ہوئی تھی، ننھی منی سی سفید گڑیا۔ مٹھیاں کسے ہوئے اور آنکھیں میچے ہوئے، اس کا پورا منہ مجھے بالکل کچی نارنگی کی طرح دکھائی دیتا تھا جس میں کچھ شفق ملے اور کچھ تازہ بلوایا ہوا کچا دودھ حل کر دیا ہو، میں دوپہر کے وقت اسی بچی کو سینے سے لگائے ہوئے مولو لاگ کی مشق کیا کرتی تھی۔ "اوں اوں ـــ میری بٹیا، مری سونا، میری کلیجہ ـــ اوں اوں ـــ میری بٹیا دودھ پیئیگی ـــ شہد کھائے گی ـــ

اوں اوں ـــ چیمڑ چیمڑ ـــ ہاہی ہی ہی اخاہ ـــ"

اچانک اسی وقت تم آگئے۔ تم اندر بلا لئے گئے۔ میں سائبان سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ گڑیا کو چمٹائے ہوئے میں آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی، میرا چہرہ پتہ نہیں کیوں فق تھا ـــ جیسے اس پر ایک رنگین ابرق گرد نڈی ہو۔ تم نہیں کر رہے تھے۔ چھوٹی باجی سے، اماں سے ماتم کانونٹ میں پڑھنے والی میری چھوٹی بہن نوشی کو چھیڑ رہے تھے اور میرا دل دھڑک رہا تھا اور اپنی پھولی پھولی چاندی کی گڑیا کو سینے سے دبائے جارہی تھی۔ اسے جوم رہی تھی اس کی آنکھیں میچی ہوئی تھیں جیسے وہ میرے دل کی دھڑکن سے خوف کھا رہی ہو۔ اس کی ننھی مٹھیاں اور زیادہ بھنچ گئی تھیں۔

تمہارا اخبار پھانسی کے پھندے میں لٹک کر رہ گیا تھا۔ کلکتہ میں کسی اور دوسرے اخبار میں جگہ کیسے مل سکتی تھی، تم بہت بدنام ہو چکے تھے ایک اخبار کی ایڈیٹری ملی بھی تو پالیسی کا سوال تمہارے لئے دیوار بن گیا۔ تم نے اسے ٹھکرا دیا اور اپنی بے روزگاری سے مجبور ہو کر وطن آ گئے تھے۔

تم دس دنوں تک رانچی میں رہے۔ ان دنوں تم ایک موٹی سی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نتالیا ملیا اہرن برگ کا ناول "اسٹارم" تھا وہ۔

ان دنوں میں تم سے بہت بدظن ہو گئی۔ وجہ صاف تھی۔ تم اپنے کسی انجینیر دوست سے میری شادی ٹھہرا رہے تھے۔ اماں اس انجینیر پر لٹو تھیں۔ وہ تم سے میرے جہیز، نیکی، اور سلیقے کی باتیں کرتیں، بڑی شاندار بڑی وودھیا باتیں

سال بیچنے کے لئے بھی ڈھنگ چاہیئے۔ تم آم کھاتے جاتے اور ہاں میں ہاں ملاتے جاتے۔ جیسے میری زندگی کے سودے میں تمہاری کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ جیسے میں کوئی ٹھیلا کھلا تھی۔ تم کتنی بے نیازی سے بالکل کاروباری قسم کی باتیں میرے متعلق کرتے تھے ان دنوں۔ اب تمہیں کیسے بتاتی کہ میرے بارے میں تمہاری گفتگو کا وہ انداز کتنے کسلے جھوٹا تھا میری روح میں، ــــ میں کوئی مرفی ریڈیو کا ایک سٹ یا بار کرفٹی ون تو تھی نہیں۔ چاہے جس میز پہ رکھ دو۔ چاہے جس جیب میں لٹکا دو۔ تمہارے ظلم پر میں دل ہی دل میں بلبلا اٹھی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ بہت رونا آیا۔ جی چاہتا تھا کہ تمہارے سب بال نوچ لوں اور سر بازار ایک گنجے کتے کی طرح تمہیں پیٹ پیٹ کر کسی ظالم سیٹھ کے پاس سستے مول نیلام کر دوں۔

شام بہت اداس تھی، ہوا ٹھنڈی تھی۔ میں نے فوراً نہا کر سفید گوٹدار ساری پہنی تھی۔ میرے بھیگے ہوئے بال میری پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں روحانی گھٹن کے ساتھ کرسی پر کمرے میں بیٹھ گئی اور ایک رسالہ پڑھنے لگی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اندر والے سائبان میں گھر کی عورتیں گھریلو کاموں میں مشغول تھیں۔ میں تمہارے گنگنانے کی آواز سن رہی تھی باہر سائبان میں بیٹھے تم کوئی نظم پڑھ رہے تھے ــــ

جب تری بزم سے بھی دور چلا جاؤں گا۔

کیوں چلے جاؤ گے ــــ اور نہ جانے کیوں اس وقت تمہاری بھاری آواز مجھے شام کی طرح دور سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی، اتنے میں تم اندر آئے ــــ میں نے بے دھڑک تم سے فرمائش کر دی۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے۔

" ذرا یہ نظم مجھے لکھ کر دے دیجئے گا انور بھائی ــــ "

" اچھا ــــ "، اور تم ہوا کے زناٹے دار جھونکے کی طرح مکان کے اندر چلے گئے۔ تم نے کسی سے پانی مانگا اور پانی پی کر تم پھر میرے کمرے سے گذرے اور باہر جا کر بت بن کر بیٹھ گئے۔ میں سمجھتی تھی تم پھر گنگناؤ گے۔ لیکن تم تو شام کی طرح سناٹے میں آ گئے تھے۔ میرے سینے کی کمین گاہ سے ایک تشنہ سی آرزو خون کے فوارے کی طرح ابھری تم نے سادہ حسن کو ایک آنکھ بھی کیوں نہیں دیکھا۔ کیوں تم نے نہیں دیکھا کہ میری زلفوں کی گھٹا میری گداز دلآویز پشت پر پھیلی ہوئی کتنی بے پناہ معلوم ہو رہی تھی ــــ دارجلنگ کی پہاڑی نشیب پر جیسے چائے کا مہکتا ہوا باغ ہو۔ کیوں تم نے نہیں دیکھا کہ میری ڈھلی ہوئی سیب کی سی آنکھیں، کیسی صاف شفاف جھیلیں ہیں۔ اور ان میں کیسی زعفران کی ارغوانی تیر رہی ہے اور میرے لبوں کا ارتعاش فضا میں گدگدی پیدا کرتا ہوا، کھویا ہوا، کتنا پیارا نغمہ ہے، رسیلا اور خاموش گیت ــــ تم نے اپنی گستاخ بے نیازی سے کتنی ہتک کی تھی مری ــــ اور میں اپنی اس تشنہ آرزو کو، اپنی اس نامراد کنواری سہیلی کو اپنے سینے میں تھپک تھپک سلاتی رہی۔

تمہارے فلسفیانہ احتراز، اجتناب اور احتیاط نے مجھے تمہارے بے داغ غرور پر چونکا دیا تھا، تم اپنے آپ کو کچھ سمجھتے تھے اور تمہیں اپنا غرور کسی اونچے قدیم مندر کا کلس دکھائی دیتا تھا۔ جسے کوئی ہاتھ بڑھا کر چھو نہ سکتا ہو۔ اور ان ہی دنوں مجھے خیال آیا ــــ اور اگر میں اس سنہری کلس کو چھو دوں تو، اس خودرو پہاڑی چشمے کا بہاؤ، اس کا منھ زور توڑ، میں اپنی زلفوں کے جنگل میں جذب کر لوں تو ــــ تمہیں اپنی گہری نازک جھیلوں میں ڈبو دوں تو ــــ تو کیا ہوا اے مغرور انسان۔ تو مجھے انجنیر کی گود میں ڈالنا چاہتا ہے۔ تو نہیں جانتا انسانوں میں مجھے انجنیروں اور پھلوں میں انجیر سے مجھے کتنی سخت نفرت ہے۔ انجیر کھانے میں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن میں صرف اسے اسلئے ناپسند کرتی ہوں کہ اس کا صوتی اثر مجھے انجنیر کی یاد دلا دیتا ہے۔

چند دنوں کے بعد بھیا بھابی کو لے کر آ گئے اور اپنا گھر مینا بازار بن گیا۔ بھابی چوچلے، ناز نخرے، اور بھیا کی بے بسی کبھی بچوں کی طرح ہمکنا، کبھی چیخنا، کبھی خاموش گدھے کی طرح کان پھڑپھڑا کر بیٹھ جانا۔ اس وقت مجھے وہ بالکل یونٹ کے ملوے سے تیار کیا ہوا پلپلا سا بھاری بھرکم ہیوا دکھائی دیتے تھے۔ ان کے دوست بھی بڑے شریر تھے، انھوں نے ان کی بھنّاوگی دیکھ کر انہیں موسیو فلاں پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ ایسے کہ خود کو بھی فرانسیسی پرنس سمجھنے لگے تھے ان کے خیال میں دوستوں نے انھیں بہت ہی مناسب ٹرمی بیوٹ دیا تھا۔ ان کی پتلونیں چھوٹی ہو گئی تھیں اور تم ان کی نازک مزاجیوں اور ریاست پسندیوں پر طنز کرتے اور پھبتیاں کستے ـــــ بھابی درپردہ بھیا کی اس حجامت میں اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین محسوس کرتی تھیں۔

بھیا آفس چلے جاتے اور ہم لوگوں کو خوش گپی کا وقت مل جاتا۔ یہ گپ شاعر کی چھیڑ خوانی سے شروع ہوتی۔ وہی شاعر جو آج میری رفیقہ، میری جگری سہیلی کا سہاگ بن گیا ہے۔ وہ کمیونزم اور ترقی پسندی کی حمایت میں کنگنیں کرتا۔ ابھی وہ نیا نیا سپاہی تھا، اس لئے دوران گفتگو میں جھنجھلا جاتا۔ بھابی اس کو چڑاتیں اور مزا لیتیں۔ مذاق کو بھی بھڑ کا چھتہ سمجھا جاتا۔ اور اب تو بھیا بھی ایسے چھیڑتے جو کبھی مارکسزم کی کتابیں اپنے سینے پر رکھ کر بڑے تیس مار خاں بنے چلتے تھے۔ اور اب تو جیسے سب کچھ بھول گئے تھے۔ انھوں نے اپنی مودودی ساس اماں کو اپنا پیر و مرشد بنا لیا تھا۔ اور اب گھر میں ان کا کام اپنے ماضی کو گالیاں دینا رہ گیا تھا ـــ جب علی گڑھ سے چلنے لگے تھے تو انھوں نے مولس رضا سے ایک تصویر بنوائی تھی ـــ مولس رضا نے اپنی تصویر پر لکھا تھا "IF YOU DON'T GO FORWARD YOU RECEDE" انھوں نے سرکاری ملازمت کرتے ہی اس تصویر کو جلا دیا اور ساتھ ہی تمہاری تصویر بھی ـــ

لیکن ان دنوں تم نے ان تمام مذاق اور خوش گپیوں کو سنجیدہ رخ دے دیا۔ وہ تمہارے جانے کا روز تھا۔ مذہب کی بحث نکل آئی تھی۔ شاعر کہہ رہا تھا ـــ "مذہب ایک مردہ حقیقت ہے ـــ ہاں اس دنیا میں ـــ" تم نے شاعر کو درمیان سے ہی روک دیا۔

"مولانا ـــ مذہب ایک نظریۂ حیات ہے ـــ حیات ارتقا کی پابند ہے۔ سماجی انسان کا نظریہ تالاب کا سڑا ہوا پانی نہیں ہے ـــ آپ نے بہتا ہوا چشمہ تو دیکھا ہوگا، آپ نے ہنڈرڈ فال تو دیکھا ہے نا ـــ بالکل اسی طرح مذاق اڑانے سے نہ تو کوئی نظریہ مرتا ہے اور نہ مرتا ہوا نظریہ زندہ ہو جاتا ہے ـــ اندھے عقیدوں کی حیثیت آسمان سے ٹوٹے ہوئے ستاروں کی ہے ـــ اور ـــ"

تم جلدی جلدی بولتے رہے، تمہارا سامان رکشا میں رکھا جا چکا تھا۔ تمہاری بس کا وقت ہو گیا تھا۔ تم نے شاعر سے کہا ـــ "جھنجھلاہٹ سے مسئلہ حل نہیں ہوتا میرے بھائی ـــ ذہن کے تاریک نہاں خانوں میں ایک ہی لمحے میں اجالا نہیں ہو سکتا ـــ دل خون کرنا ہوگا ـــ تب کہیں ہاں تب کہیں ـــ"

تم چلے گئے۔ ایک سال کے اندر تمہاری یاد کے نقوش کسی قدر مبہم اور مدھم پڑ گئے تھے۔ ایک ان پر ایسی صیقل ہوئی تھی کہ میں چکاچوند ہو گئی۔ تمہارا خیال ایک بے نیام تلوار کی طرح ہر وقت میرے ذہن میں چمکتا رہتا۔ چاندی کی لکیر کی طرح ابھرتا رہتا ـــ

ایک ہی ماہ کے بعد جب ہم تمام لوگ یہاں پہنچے، اپنے گاؤں میں تو، تم یہیں ہائی اسکول میں ماسٹری پر مامور ہو چکے تھے۔ تمہیں کہیں شہر میں ملازمت نہیں ملی تھی، اور ابا نے تمہیں اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ تم غریب اور مفلس جو تھے۔ آخر تمہارا سہارا کیا تھا۔ ابا سہارا نہ دیتے تو پھر تم زندہ کیسے رہتے ـــ اب بیٹھے کہتے پھرتے ہیں، تو ٹھیک

ہی کہتے پھرتے ہیں ۔۔ "

صبح دس بجے تم اسکول جاتے اور شام کے پانچ بجے لوٹتے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے دیکھتے ہی تمہارے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ تیر جاتی، گھاس پر دوڑتی ہوئی دھوپ جیسے۔ وہ مسکراہٹ مجھے تم سے کھیلنے، تمہیں پاگل بنا دینے، تمہیں اوندھے منھ گرا دینے پر مجبور کر رہی تھی ۔۔۔ تمہاری عظمت، تمہارا بے داغ غرور، تمہاری بیگانہ روشی ۔۔۔ سب پاش پاش ہو جانے کے لئے تمہاری مسکراہٹ میں مچلنے لگتے تھے۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ میں تعلیم کی کیسی دلدادہ ہوں۔ تمہیں اپنے پاس دیکھ کر تم سے پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ابا بیمار ہو کر شہر گئے ہوئے تھے۔ اماں بھی ساتھ گئی تھیں۔ گھر میں میری بوڑھی دادی اماں تھیں جو کسی مذہبی داستان کا پر نور کردار نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے تعلیم پانے کی اجازت دیدی۔

پہلے تم صرف شام کے وقت پڑھاتے تھے اور ہمارے درمیان ایک اجنبیت سی رہتی تھی۔ تم پڑھاتے اور سختی سے پڑھاتے۔ میں تمہارے پندار کی ہر سانس کو محسوس کرتی۔ مجھے تم نے ایک روز ٹاسک نہ کرنے پر کاپی پھاڑ کر پھینک دینے کی دھمکی دی، اس وقت بہت لال پیلے ہو گئے تھے ۔۔۔ ستمبر کا مہینہ تھا شام کے بعد ہوا میں خوشگواری پیدا ہو جاتی تھی۔ آسمان پر چاندنی میں نہائے ہوئے بادل کے ملگجی ٹکڑے تیر رہے تھے تم اس روز اقبال کی نظم پڑھا رہے تھے۔ شاید ساقی نامہ تھا۔ اس روز تم نے زندگی کے تضاد جدلیات اور ارتقا کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں تم نے کہیں کہیں اقبال سے اختلاف بھی کیا۔ اور کہیں تم نے تعریف کے پل باندھ دیئے تھے اور جب تم "گراں خواب چینی سنبھلنے لگے" تک پہنچے تو پوری طرح رواں تھے، بالکل طوفان میں ۔۔۔ تم نے چین کی تاریخ انقلاب اور ایشیائی جنگ آزادی پر باضابطہ تقریر ہی تو شروع کر دی تھی۔ میں تمہیں آنکھیں گاڑ کر دیکھتی رہی۔ ہاں اپنی دیپ کی طرح جلتی ان ہی جھیلوں سے ۔۔ تم اس وقت بہت اچھے لگے، بالکل سنجیدہ علمی اور سیاسی باتیں کرتے ہوئے، ہوا میں انگلیاں لہرا لہرا کر ۔۔۔ اور یہ تمہاری خصوصیت تھی، جب تم بولتے تو بولتے چلے جاتے ۔۔۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے پانی کی طرح اور کبھی چپ ہوتے تو جنگلی جھاڑیوں کی طرح پیچیدہ اور سنسان نظر آتے، پر اسرار اور کسیلے غصہ والے اور متفکر۔

اتنے میں تمہارے حسن چچا آ گئے اور انھوں نے اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں کوریا کی جنگ پر عالمانہ روشنی ڈالنا شروع کی۔ میں آنگن سے اٹھ کر سائبان میں چلی گئی اور تم دیر تک ان سے الجھتے رہے۔ اماں ان کی باتوں سے خوش ہوتی رہیں، کہ اب کے چاول گراں بکیگا اور سونے کے زیورات ذرا زیادہ بن سکیں گے۔ چچا جان جب چلے گئے تو تم نے مجھے اٹلاس دکھایا اور تم نے چین و جاپان کے درمیان ایک ناؤ سی آستین پر انگلی رکھ کہا ۔۔۔ "دیکھو یہ کوریا ہے ۔۔۔ اور دیکھو انجن کے اوپر، یہاں سے فرضی لکیر اڑتیسویں متوازی گذرتی ہے۔ دیکھو یہ پوسان ہے، اور دیکھو یہ سیول ہے ۔۔ اور یہاں تک دوبارہ امریکی فوج واپس پہنچ گئی ہے ۔۔۔ شمالی کوریا کے سپاہی ایک ایک قدم پر خوفناک جنگ لڑ رہے ہیں ۔۔۔ سامراجی ملکوں کے دلوا اپنی فوجیں بھیج چکے ہیں ۔۔۔ فوج شہر کو ویران کر سکتی ہے، آگ لگا سکتی ہے، عورتوں کا ننگا جلوس نکال سکتی ہے ۔۔۔ عوام کو کون مار سکتا ہے ۔۔ ان کے ضمیر کو؟ ۔۔۔"

تم نے کھانا کھایا، اور لیٹن پی اور باہر چلے گئے۔

اس روز تمہاری باتیں خواب میں بھی سنتی رہی، تمہارا وہی سنجیدہ، سانولا چہرہ، لمبا قد، الجھے الجھے باغی قسم کے بال، بھرے بھرے لب، آنکھوں کی چمک صبح جب میری نیند ٹوٹی تو جاگ کر تھوڑی دیر بعد میں اس خواب کو دیکھتی رہتی۔ ہائے ۔۔۔ تھوڑی دیر اور یہ جنت مجھ پر سایہ فگن رہتی۔

لیکن تم تو وہاں سویرے سے ہی آ کر اپنی کرسی پر ڈٹ گئے تھے اور پڑھنے کے لئے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اسی روز چھوٹی باجی نے تم سے کہا تھا۔ ”جانتے ہو انور بھائی! سوکیا کہہ رہی تھی ——“

”کیا —— ؟“

”وہ کہہ رہی تھی کہ پہلے میں انور بھائی سے شرماتی تھی اور اب ماسٹر ہو جانے کی وجہ سے ڈرتی ہوں —— اور بڑا فرق لگتا ہے اس کو آپ سے ——“

اور جب میں پڑھنے کے لئے بیٹھی تو تم نے پہلی بار اپنی عقابی نظروں سے ٹھیک میرے چہرے پر گھورتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ۔ ”تم مجھ سے ڈرتی کیوں ہو۔ مجھے اس بات کا رنج ہے کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو ——“ میں ہنس پڑی اور تم سہم گئے۔ میں نے دیکھا تمہاری آنکھوں میں واقعی رنج تھا۔ تم کچھ گھبرائے ہوئے تھے تم نے جلدی سے میرے حساب کی کاپی اٹھائی —— اور ٹاسک دیکھنے لگے۔

اس دن مجھے محسوس ہوا کہ میں ہوا میں سنسناتی ہوئی پری کی طرح ہلکی ہو رہی ہوں۔ اور اب میں ایک ہی جست میں سمندر کے کلس کو چھو سکتی ہوں۔ کلس کو سر سے گرا سکتی ہوں۔ میں سنبھل گئی۔ اور جست لگانے کے وقت کا انتظار کرنے لگی۔ تم قید ہو چکے تھے۔ اب تو یہ سوچ کر تمہیں پنجرے میں ڈالنا تھا —— میں ہر لمحہ سمندر میں تیرتی رہتی امید اور فتح کے سمندر میں۔ ان ہی دنوں میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ فتح کا احساس کتنی پاکیزگی اور کیسی شگفتگی رکھتا ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ تم مارننگ اسکول ہونے کی وجہ سے سویرے ہی چلے گئے تھے۔ تم تقریباً دس بجے لوٹے۔ تمہارے ہاتھ میں ایک ننھی سی گلاب کی کلی تھی جس میں دو سبز پتیاں بھی لگی ہوئی تھیں —— تم نے وہ کلی میری میز پر رکھ دی۔ اور میں نے ابھی اسے اٹھانے کو ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ سشما پرنوشی آئی اور جھپٹ لے گئی وہ کلی —— میرا جی دھک سے ہو گیا۔ کیا برا شگون تھا۔ اور میں کس طرح چیخ کر خوشامد کرتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی ہوں تمہیں یاد تو ہوگا۔ ”میری نوشی۔ میری بیٹا —— دیدو میری اچھی نوشی۔“ اور جب دوبارہ وہ کلی وہ میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے سوچا ان دو پتیوں کی طرح اگر تم اور میں یکجا ہو جائیں تو ہماری زندگی کھل کر پھول بن جائے —— اور شاید تم نے بھی یہی سوچا تھا۔ یہ تو سوچا تھا نا —— ہنستا ہوا، خوشبو کی تتلیاں اڑاتا، زندگی بکھیرتا۔ جھومتا ہوا۔ گلابی پھول۔

اس وقت میں نے انگوری ساری پہن رکھی تھی۔ اور کان میں میرے سونے کے ٹاپس چمک رہے تھے۔ اور کیا غضب کیا تھا میں نے پان جو کھا رکھا تھا۔ میں نے اس کے بعد آئینے میں دیکھا تھا۔ اللہ میرے ہونٹ خون میں ڈوبے ہوئے دو یاقوتی ہلال سے چمکتے نظر آ رہے تھے۔

تب تم مجھے سر سے پیر تک کتنی معصوم اور حریصانہ نظر سے دیکھ رہے تھے جیسے میں ناگا پربت کا کوئی کھلا ہوا پھول تھی اور سورج کے بدلتے ہوئے رنگوں کے ساتھ جلد جلد اپنا لباس بدلتی جا رہی تھی۔ برف زار میں مسکراتا ہوا پھول —— حالانکہ میں بالکل تمہارے پاس تھی۔ تمہارے سامنے، ہمارے درمیان صرف ایک چھوٹا سا ٹیبل تھا اور سامنے کمرے میں چھوٹی باجی اپنی بچی کی خدمت گذاری کر رہی تھیں اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ دنیا کتنی تیزی سے گردش کر رہی ہے اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگے ہیں۔

اسی روز شام کے وقت پڑھاتے ہوئے تم نے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اور رومال نکالتے ہوئے پوچھا ”تمہیں صبح کا تحفہ پسند آیا ——“ تمہارے رومال سے یوکلپٹس کی بو نکل رہی تھی۔

”بہت پسند آیا“

"وہ کہاں رکھا ہے تم نے ——؟"
"اپنی آنکھوں میں ——" پھر سینے پہ ہاتھ رکھ کر میں بولی۔ "یہاں —— ایں" کہو مجھ میں کتنی فنکاری آگئی تھی کہ تم بالکل چکرا کر رہ گئے؟۔

تمہارا چہرہ کھل اٹھا۔ تم سے کچھ کہا نہ گیا۔ لیکن تم نے اپنی ان سحرکار آنکھوں سے اس طرح دیکھا کہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں تن گئی۔ اس حسین لرزش کے لئے آج تک میں تمہاری شکرگذار ہوں۔ اس لئے کہ وہ لرزش زندگی میں عورت کو شاید ایک ہی بار نصیب ہوتی ہے۔ ایک لطیف سی سنسنی، خوشبودار ہوا کے لمس کی طرح، روح میں ایک نغمہ زن سرگوشی —— جانتی ہوں اس وقت میری آنکھیں نشے سے بھر گئی تھیں۔ اور مجھے نیند سی آنے لگی تھی، میرے کان کے پاس بھی لرز رہے تھے۔ تم نے ایک گلاس پانی منگوا کر پیا اور مجھے پڑھانے لگے۔ اقلیدس پڑھانا اس وقت تمہیں کتنا عجیب معلوم ہوا تھا۔ تم رک گئے، جیسے سائیکل کے تمام اسپوک ٹوٹ گئے ہوں۔ تم نے پھر میری طرف ان ہی بھیری ہوئی عقابی نظروں سے دیکھا اور آنکھیں جھکا کر کہنے لگے۔

"میں ساری پسند نہیں کرتا —— میرے خیال میں یہ بہت ہی ننگا لباس ہے —— تم شلوار پہنا کرو ——" اب تم سیدھے میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

"کیوں ساری میں کیا بات ہے؟"

"ساری سے جنسی کشش میں اضافہ ہوتا ہے اور ابھی تم کو اس کی ضرورت نہیں ——" اس روز کے بعد ایک دن اور میں نے ساری پہنی۔ تم کو جلانے میں بہت مزا آیا۔ تم خوب کڑھے —— تم نے اس روز ایک بار بھی بھرپور نظر سے نہیں دیکھا، دوسرے دن سے پھر میں نے تمہارے سامنے کبھی ساری —— نہیں پہنی۔ ہمارے درمیان ایک عجیب طرح کی والہانہ پن پیدا ہوگیا تھا اور یہ والہانہ پن روز بروز دیوانگی کی حد تک بڑھتا جارہا تھا۔

چند ہی دنوں کے بعد تم کچھ متفکر نظر آنے لگے۔

میں نے تم سے وجہ پوچھی، تم نے اس کے جواب میں ناکامی اور محرومی کا خوف دلایا۔ تمہیں خطرہ تھا کہ میرے والدین ہرگز اس محبت کو کامیاب نہ ہونے دیں گے، تم نے اس بات پہ بہت زور دیا کہ میں ایک بڑے زمیندار کی بیٹی تھی اور تم ایک معمولی ڈاکٹر کے بیٹے جو اپنی شرعی ایمانداری کے پھیرے میں اپنے پیشے سے نفع نہیں اٹھا سکا اور اس کا نہ بینک میں کچھ تھا اور نہ زمینداری ہی تھی۔ پھر —— اور یہ اندیشہ ٹھیک تھا کہ تمہاری سیاسی اور ادبی زندگی خطرناک سمجھی جاتی تھی، اور اسی لئے نہ تمہاری آزادی کا ٹھکانہ تھا نہ زندگی کا۔ لیکن میں نے تمہیں ہر بار مطمئن کر دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں تمہارے بزدل اندیشوں پر ہنستی تھی۔ اف اس شخص کو مجھ پر بھروسہ نہیں —— نہیں جانتا کہ میں اس حویلی کی سب سے چالاک مخلوق ہوں۔ بہترین چیز، اڑتی چڑیا کا رخ پہچاننے والی —— اور میں نے جلد ہی تمہاری شکست خوردگی اپنے دم دلاسے سے ختم کر دی۔ اور تم کو ایک ناتواں تنکے کی طرح بہا لے گئی۔ تم میرے، صرف میرے۔ سمندر کا سنہری کلس میری مٹھی میں تھا —— ایک چھوٹی سی افشاں بھری بے پر تتلی۔

اور یہ آئینہ —— دیکھو دیکھو —— یہ ہماری پہلی ہم کناری کا گواہ ہے۔ تم اسکول جاتے ہوئے کمرے میں آئے تمہیں الماری سے وہ انگریزی کتاب نکالنی تھی جس کا تم ترجمہ کر رہے تھے، میں الماری کے پاس کھڑی تھی۔ تم میرے قریب آ گئے تھے، تم الماری کے پاس جھک گئے اور اپنی کتاب ڈھونڈنے لگے، میں نے

تمہیں پیار سے ایک چپت لگا دی۔ تم فوراً کھڑے ہو گئے۔ تم نے ایک شریر اور وحشی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا۔ تم اور قریب ہو گئے، تمہاری سانس میرے رخساروں پر ناچنے لگی۔ میں نے اپنا سر تمہارے سینے پر رکھ دیا۔ تم نے مجھے سمیٹ لیا اور میرے لب چوم لئے، میری آنکھیں، میرے گال اور پیشانی پر سیاہ سا مسہ ــ اس وقت میں سورج کی طرح جل اٹھی تھی۔ تم چلے گئے۔ لیکن میں یہیں آئینے کے پاس الماری کے قریب دیر تک کھڑی رہی اور میرے پیر ڈگمگاتے رہے۔

شام کو تم نے بتایا کہ تم ایک ادبی اجتماع میں شرکت کرنے کے لئے شہر جا رہے ہو ــــ تمہارے ادیب ساتھیوں نے تمہیں بلوا بھیجا تھا۔ میں تنہائی کے احساس سے گھبرا گئی۔ اب میں تمہارے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی، یہاں تک کہ اسکول سے واپس آنے میں دیر ہو جاتی تو میں تڑپ تڑپ اٹھتی تھی اندر ہی اندر۔

صبح ابھی سرمے کی طرح اڑ رہی تھی ــــ میں جاگ گئی تھی۔ میں نے رضائی سے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کا گلا دبا دیا۔ دکھی دالان میں نیم تاریکی جھلملا اٹھی۔ دروازہ ہلکے سے کھلا۔ اور تم گرم پتلون اور قمیص پہنے کمرے میں داخل ہوئے۔ تم فوراً نہا کر آئے تھے۔ تم نے دائیں طرف حسب معمول مانگ نکال رکھی تھی۔ اور بائیں ابرو کی طرف بال کا ایک گچھا چمکیلی اسپرنگ کی طرح جھول رہا تھا۔ میں تمہیں اپنی الّسائی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور تم میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ تم میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ تمہاری طرف اٹھا دیا۔ تم نہا کر آئے تھے۔ لیکن پھر بھی تمہارا ہاتھ گرم تھا۔ تم جھکے۔ اور تم نے میری پیشانی اور آنکھیں چومیں اور میں نے اپنا ہاتھ تمہاری گردن میں ڈال کر بہت ہی خفیف آواز میں پوچھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے نہ جانے کیوں مری آواز میں ایک خمار زدہ تھرتھری تھی ــــ "کب آئیں گے آپ ــــ خدا کے لئے جلدی آ جائیے گا"۔ تم ہنسے اور میرا گال تھپتھپا کر چلے گئے ــــ تم منہ سے کچھ بھی نہ بولے ــــ

نہیں کہہ سکتی تمہارے انتظار میں تین دن کیسے گزرے، تم جو آئے بہار آ گئی۔

تم واپس آئے تو بھابی اپنی بچی کی موت کے بعد صحت یابی کے لئے گاؤں آ چکی تھیں اور ان کی شاندار حماقتوں، ریشمی ساری اور بلاؤز میں لپٹی ہوئی طفلانہ حرکتوں نے گھر میں دلچسپی اور تفریح کا کافی ذخیرہ مہیا کر دیا تھا۔

"کہئے پٹنہ کا سفر کیسا رہا ــــ جلسہ کیسا ہوا؟"

"بہت کامیاب رہا جلسہ"

"صدارت کس نے کی ــــ"

"میں نے ــــ میں کام کے لاجواب موڈ میں تھا ــــ اور کام خوب ہوا ــــ"

"لائیے میرا انعام ــــ جناب موڈ تو میں نے ہی شاندار کر دیا تھا ــــ کیوں غلط کہتی ہوں ــــ" تم نے ہتھیلی میری طرف بڑھا کر کہا ــــ

پھر تو تمہارا معمول ہو گیا کہ تم اسکول جاتے وقت کمرے میں آتے اور ہم اپنے اپنے لبوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہتے۔ دن بھر میں دھوپ میں بیٹھی ٹاسک کرتی رہتی اور شام کا بے چینی سے انتظار کرتی رہتی، ان دنوں بھائی کو بھیا کے خط کا شدید انتظار رہتا اور ایک دن بھی خط کے آنے میں دیر ہوتی تو وہ سمجھتیں کہ بونٹ کا حلوہ کوئی چٹ کر گیا، پھر ان کا رونا۔ روٹھنا، اور ہونٹ لٹکانا۔ ان کا خط آیا ہوتا بھی تو تم ان کو گھنٹوں پریشان کرتے۔ کبھی وہ

تم بہ پانی چھینکتیں، کبھی خوشامدیں کرتیں اور تم ہنستے جاتے ـــــ "یہ سب محض دکھاوا ہے ـــــ آپ کو موسیو کے خط کا انتظار وغیرہ کچھ نہیں ہے ـــ آپ لوگوں کا انتظار کیا اور آپ لوگوں کی محبت کیا ـــ؟ اور ایک دن، سی مذاق مذاق میں بات سیریس ہو گئی؟

"تو آپ یہ سمجھتے ہیں میں اپنے شوہر سے محبت نہیں کرتی ـــــ؟" بھابی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈنے لگا تھا ـــ"

"آپ اپنے شوہر کی تنخواہ۔ سوٹ اور ان کے اباجان کی زمینداری سے محبت کرتی ہیں، اگر یہ سب کچھ ان کے پاس نہ ہوتا تو آپ ان سے شادی بھی نہ کرتیں ـــ کہئے میں نے کوئی غلط بات کہی ـــ؟"

اب کیا پوچھنا تھا۔ بھابی تو چھچھوندر کی طرح جل رہی تھیں اور تم ہنس رہے تھے۔

"خبردار آپ نے پھر یہ باتیں مجھ کو کہی ہیں تو میں یا اللہ اوں اوں اوں۔ اماں جی ـــ اوں اوں" بھابی روتی رہیں اور میں نے ہاتھ جوڑے، "خدا کے لئے ان کو مت چھیڑیے۔ آپ تو ان کا دماغ جانتے ہی ہیں ـــ"

دوسرے دن شام کو اتفاقاً بھابی تمہارے کمرے میں گئیں۔ اور اس کا اعتراف ہے کہ اس بلا تنگ میں میرا ہاتھ بھی تھا۔ ہم دونوں نے مل کر تمام چیزیں تمہارے ٹیبل سے اٹھا کر ٹب میں ڈال دیں، تمہارا آئینہ شیونگ سٹ، ٹوتھ برش، سب کچھ پانی میں، تمہاری چھتری کو چھتری اوڑھائی گئی اور اس پر تمہارا ہیٹ اوندھا دیا گیا اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر "یہ الو ہے" لکھ کر پن کر دیا گیا۔

شام کے وقت تم اپنے کمرے میں آنے والے انقلاب کا نظارہ کر کے بالکل نارمل طریقے سے مسکراتے ہوئے اندر آئے اور تم نے اپنی خفت کا اظہار کیا اور نہ خفگی کا۔ بھابی کو امید تھی کہ تم بھنائے ہوئے آؤ گے اور ہنسنے کا اچھا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ تم اچھی طرح بد مو بنو گے۔ لیکن تم اطمینان سے چائے پی رہے تھے اور اخبار دیکھ رہے تھے ـــــ آخر بھابی سے نہ رہا گیا۔

"کیوں انور بھائی ـــــ آج آپ کے کمرے میں کوئی الو آیا تھا؟"

"ہاں آج میرے کمرے میں ملکۂ بومستان آئی تھی ـــــ جا بجا بومیت کے گہرے نشان بکھرے ہوئے ملے ہیں مجھے ـــ کیا خیال ہے آپ کا ملکۂ بومستان کے متعلق؟" بھابی کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھیں۔

ہمارے عشق کا اثر میری تعلیم پر پڑ رہا تھا۔ ترقی رفتار میں سستی آگئی تھی ـــــ پھر بھی تم مجھے میرے امتحان کی کتابوں کے علاوہ کچھ سماجی تاریخی اور ترقی پسند ادب کی بنیادی تعلیم بھی دینے لگے تھے۔ تم کہتے تھے کہ بغیر پورا شعور رکھے ازدواجی رفاقت فیل ہو جاتی ہے اور تم گویا مجھے ہمارے مشترکہ مستقبل کے لئے تیار کر رہے تھے۔

میرے دونوں دولھا بھائی آئے ہوئے تھے، بڑے دولھا بھائی نے اپنی رجعت پسندی میں میری تعلیم کی مخالفت کی اور انھوں نے تمہاری طرف سے خطرے کی گھنٹی بجائی ـــ "ماسو کا رجحان بہت کچھ انور سے ملتا جلتا ہے اور یہ خطرناک بات ہے، یہ لڑکی باغی ہو جائے گی، دیکھنا، دیکھنا ـــــ"

بڑے دولھا بھائی جا چکے تھے، ڈاکٹر دولھا بھائی ادھر ہی تھے، رات کا وقت تھا اور صبح الکیس جانا تھا۔ شام کے وقت تم اور دولھا بھائی شکار پر چلے گئے تھے۔ اور تم لوگ تین بگلے، دو فاختہ، ایک کبوتر ایک مینا مار لائے تھے۔ فاختہ کو مردہ دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا، میں فاختہ کو اپنا دل سمجھتی ہوں۔ معصوم سی خوبصورت سی دھڑکتی ہوئی دنیا ـــ دولھا بھائی کوٹھے پر شکار کا کارنامہ سنا رہے تھے اور اپنے چوکے ہوئے نشانوں کی توجیہہ کر رہے تھے

"یہ بندوق خراب ہوگئی ہے" اس کی نال سے نکلے ہوئے چھرّے سیدھے میں نہیں جاتے اور نشانہ تک پہنچنے سے پہلے ہی زمین چھرّوں کو کھینچ لیتی ہے ــــ وہ تو بڑی کوشش کے بعد یہ چڑیاں مار سکا ــ وہ خدا جھوٹ نہ بلائے جب میں لندن میں تھا ــــ" میں نیچے چائے لانے کے لئے جا رہی تھی۔ ٹھیک زینوں کے موڑ پر اندھیرے میں تم اوپر آگئے۔ تم بھی رک گئے اور میں بھی رک گئی۔ جب تم مجھے اپنے سینے سے لگانے لگے تو میں نے کہا ــ الو ــــ آج بھائی نے زبردستی پونڈس لگا دیا ہے۔ برا تو نہ مانو گے"۔ تم نے میرے لب چومے اور دولہا بھائی کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ پونڈس لگانا گناہ نہیں۔ پونڈس میں غرق ہو جانا گناہ ہے۔

کچھ دنوں میں گھر میں ایک دم سناٹا سا ہو گیا۔ تمام لوگ جا چکے تھے نہ بڑی باجی تھیں، نہ چھوٹی باجی نہ ان کی اچھی اچھی شریر اور بیوقوف بچیاں۔

میں کوٹھے کے کمرے میں بیٹھی اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ تم دھڑلے سے وہاں پہنچ گئے تمہارا منہ اترا ہوا تھا۔

"میں کل چلا جاؤں گا ماسو، یہ ڈرامہ ختم ہونا چاہئے ــــ میری منزل دوسری ہے۔ تمہارے عزیز تمہیں دوسری آغوش میں ڈال دیں گے ــــ تم اپنے ماحول کی قیدی ہو ــــ"

میں نہیں کہہ سکتی کیسی آگ لگ گئی میرے جذبات میں اس وقت اور کس قدر نڈر ہو کر میں نے خود کو تمہاری گود میں ڈال دیا تھا۔ میں تمہاری ضدی طبیعت کو جانتی تھی۔ لیکن اس بار میں پھر تمہیں شکست دینے میں کامیاب ہوگئی۔ کئی بار اس کے بعد بھی تم جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن اب تم میری گرفت میں تھے تم جا کہاں سکتے تھے۔ تم بار بار زندگی کے مستقبل پر ٹھوس باتیں کرنا چاہتے ــــ "آخر اس طرح کیسے کام چلے گا۔ ہمیں کوئی پروگرام مرتب کرنا ہوگا اور ایک دوسرے کو حاصل کرنے کے لئے جنگ کرنی ہوگی ــــ"

"میں تیار ہوں ــــ"

اور اس کے بعد مجھ میں ایک نئی جرأت پیدا ہوئی، رات کا وقت، سنائی چور کی طرح دبکی ہوئی رات، ہوا میں برف بہہ رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ لحاف سے نکلی، جیسے کیچلی سے سانپ نکلتا ہے ــــ اور حویلی سے نکل کر پچھلے زینے سے لمبی لمبی ڈرائنگ گھاس پر سے گذرتی ہوئی تمہارے کمرے میں باہر پہنچ گئی۔ اوہ کیسی دانت کٹکٹاتی سردی تھی لیکن میری سانس اور میرے رخسار جل رہے تھے، میرے لب تھرتھرا رہے تھے۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ میں جا کر تمہارے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ تم نے اپنی کتاب بند کر دی ــــ اف کیسی حسرت بھری نظروں سے تم نے دیکھا تھا۔ میں صرف دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ تم رضائی مجھ پر ڈال اور خود رضائی سے باہر ہو گئے۔ میں تمہیں جاڑا کھاتے کیسے دیکھ سکتی تھی میں نے رضائی تم پر بھی ڈال دی۔ تمہارے پہلو میں مجھے کیسی نرم، مضبوط، سوزاں، خوبصورت جنت ملی، کیسا مہکتا ہوا کیسا نکھرتا ہوا فردوس۔ اور میں پگھلتی چلی جا رہی تھی جیسے میرا جسم نہ ہو برفاب نہ ہو۔ اور تم میرے گیسو سے کھیلتے رہے اور کبھی میں تمہارے اجڈ بالوں سے کھیلتی رہی ــــ اب کیا کیا بتاؤں ــــ اسی رات ہم دونوں نے عہد کیا کہ ہر طرح کے ظلم سے ہم ایک ساتھ لڑیں گے ــــ حیات کے صحرا سے نکلیں گے۔ پھول اگائیں گے گائیں گے اور بڑھیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ دنیا کیا بگاڑ لیتی ہے۔ میں نے تمہارے سر کو اپنی گود میں لے لیا۔ میرا یہ رومانی انداز تمہیں بہت اچھا لگا تھا۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اس لذت کو پا لیا تھا اور پھر میں تمہاری گود میں جیسے بیہوش ہوگئی، جیسے سب کچھ جیت گئی۔ جیسے سب کچھ کھو بیٹھی۔ اس رات کے بعد میں کئی بار تم سے

چھپ چھپ کر ملتی رہی۔ خواب دیکھتی رہی۔ اور تمہیں خواب دکھاتی رہی۔ لیکن بھابی نے تاڑ لیا تھا اور انھوں نے بھائی کے کان بھر دیئے تھے۔ پھر تو بھیا نے اماں کو سخت نگرانی کی تاکید کر دی تھی ـــ لیکن میں بھلا ماننے والی تھی، ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی گرد کہیں آفتاب کی روشنی کو دھرتی تک پہنچنے سے روک سکتی ہے۔ ذرا دیکھنا ـــ ہاں۔

لیکن میرے خدا ـــ، وہ رات جب تمہاری آغوش سے چھین لی گئی، جیسے ڈالی میں جھولتا ہوا گل شہلا نوچ لیا گیا ہو۔ اماں نے مجھے تمہارے کمرے میں پکڑ لیا تھا اور یہ سب اس کانی بوا کی کارستانی تھی جس کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھ سکتے تھے اور جو تمہیں زندہ کھا جانے کی فکر میں رہتی تھی ـــ ایک روز کانی بوا نے تم سے پوچھا تھا "وہ کیوں انور ـــ مجھکو نہیں پڑھائے گا تو ـــ ماسو کی طرح میں بھی پڑھوں گی ـــ ے"

نہیں آپ مجھ سے نہیں پڑھ سکیں۔ اللہ میاں کی یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہوگا۔ عرش معلی پر جانے کے لئے جنت میں ٹکٹ ضرور دلوا سکتا ہوں۔ کہئے کیا خیال ہے" اور بوا بڑبڑاتی ہوئی پایہ پکڑ کر دوسرے سائبان میں چلی گئی تھی ـــ

اماں نے رات کا ماجرا ابا سے بالکل بلیک اوٹ کر دیا۔ لیکن شطرنج کی چال درست ہونے لگی، تمہارے ہٹانے کا سوال یوں حل ہونا تھا کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تم روز بروز دماغی مریض بنتے جا رہے تھے۔ مردہ، بے لس اور غم زدہ، کھانا پینا بھی تمہارا دوبھر ہو گیا تھا ـــ اور اس روز واقعی تم پاگل ہو گئے۔ جب تم نے بندوق سے خودکشی کا اقدام کیا تمہاری دیوانگی کی کہانی پھیل گئی، ان دنوں میں کس طرح میں پھانسی کے پھندے میں جھولتی رہی۔ تمہیں کیا معلوم۔ کتنا روتی کلپتی رہی۔ تمہارا چھینا جانا، میری دنیا چھن رہی تھی، صبح کے وقت تم روانہ ہو رہے تھے، میں نے اپنے کمرے کا دروازہ دبے پاؤں آہستہ آہستہ کھولا، تم اپنے گرم سوٹ میں سامنے اسی کرسی پر بیٹھے تھے جس پر میں بیٹھا کرتی تھی۔ میں نے اپنے جمپر کے اندر سے وہ خط نکال کر تمہیں دکھایا جو تم نے انتہائی یاس میں مجھے گذشتہ شام کو لکھا تھا میں نے وہ خط پھر سینے میں چھپا لیا ـــ میں نے ہاتھ سے پھر لوٹ آنے کا اشارہ کیا ـــ خدا پناہ ـــ تم کس طرح مسکرائے تھے، جیسے پکا ہوا زخم آہستہ آہستہ شدت کرب سے منہ کھول رہا ہے۔ ہنس رہا ہے۔

تم چلے گئے اور میں گھٹا ٹوپ رات میں غرق ہو گئی۔ میں تمہیں چلے جانے کے بعد بھی روکتی رہی، میں اس وقت اونچے ٹیلے پر کھڑی تھی اور تمہیں دیکھ رہی تھی۔ مرغزار کو، بہتے ہوئے چشمے کو، سرسوں کے پھولوں سے بھرے ہوئے ناچتے خوشبودار کھیت کو، شفق کی شوخ مینا کاری ـــ اور میں اسی طرح زندگی کے اونچے ٹیلے پر تنہا کھڑی دیکھتی رہی اور دیکھتے دیکھتے تم زندگی کے ان ہی گرد و غبار میں لپٹے ہوئے شفق زاروں میں اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے کھو گئے جن سے طلوع ہوئے تھے، تم چمکیلی تتلی کی طرح اڑ گئے اور میں ایک بیوقوف بچی کی طرح جیسے باہیں پھیلا کر اور مٹھیاں بھینچ کر بھاگتے بھاگتے تھک گئی۔ لیکن اب میں ٹیلے پر نہ تھی۔ میں پھسل چکی تھی اور پہاڑ کی چوٹی سے پھسلی ہوئی چٹان کی طرح لڑھکتی چلی جا رہی تھی، کٹتی۔ پھٹتی۔ لوٹتی ـــ

میری اماں اور گھر والوں نے تمہاری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اچھی طرح اور پوری کامیابی سے یہ مشہور کر دیا کہ تم پاگل ہو گئے اور تم علاج کے لئے شہر بھیج دیئے گئے ہو ـــ دماغی خلل تو تمہارا خاندانی ترکہ تھا، اسی لئے بڑی آسانی سے اندھیرے میں یہ کھوٹا سکہ چل گیا۔

دس دنوں تک سینے پہ رکھی ہوئی تمہاری یاد کی سل سے خون رستا رہا۔ میں تڑپتی رہی، روح دکھتی رہی۔ آنکھیں نیند سے بیگانہ اور لب مسکراہٹ کی فضا سے محروم رہے ہیں۔ مسکراہٹ میری مسکراہٹ ہی تو تمہاری آنکھوں میں قوس قزح کا رنگ بھر دیتی تھی، مگر اب کہاں تھی میری وہ مسکراہٹ۔ میری وہ ادنیٰ کنیز ـــ لیکن میں عملی طور پر مفلوج ہو چکی تھی، میری محبت یا ہوس جو بھی کہو، مفلوج تھی، محبت تو گویا مری جا رہی تھی، البتہ ہوس کو گھر والے بیدار کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور میں دیکھ رہی تھی زندگی کے حجاب سے چند مبہم شاہراہیں ابھر رہی تھیں جو مبہم مستقبل کو جاتی ہیں۔ لوٹ جانے سے پہلے آخری بار بھڑکی اور میں نے تمہاری بہن کو خط لکھا۔ دراصل وہ خط تمہارے نام تھا، میں نے کتنی آرزوں کو زبان بخش دی تھی یہ لکھ کر ـــــ کہئے اب آپ کب آتے ہیں انور بھائی ـــ؟"

تم نہیں آئے البتہ دس دنوں کے بعد چھوٹے بھیا آئے، ان کی کانفرنس اماں جان سے ہوئی۔ اب جو بھیا میرے پاس آئے تو بالکل بدلے ہوئے انسان تھے، اب وہ انور بھائی کے مداح نہیں تھے۔ اب تو وہ ان کو گولی مار دینے کی باتیں کر رہے تھے۔ آخر خاندانی خون تھا، جوش آ گیا۔ اور اس طرف کیلشیم کا انجکشن اور انڈے کا حلوہ بھی غیر معمولی مقدار میں زیر استعمال رہا تھا ـــ" تم نہیں جانتی ہو، سو انور کمینہ آدمی ہے اس کا کیرکٹر کتنا گرا ہوا ہے۔ تم اس کے ساتھ کبھی سکھی نہیں رہ سکتیں۔ وہ تو صرف تمہیں بدنام کرنا چاہتا ہے اور اس طرح تمہاری دولت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے ـــ جس کے گھر میں فاقہ پڑتا ہو اس کے جسم اور دل میں تمہیں کیا ملے گا ـــ بولو ـــ ان کا کیا ہے وہ تو چھوکریوں سے اپنا جی بھر لیں گے۔ یہی ان کی تاریخ رہی ہے ـــ فلرٹیشن اور کچھ نہیں اسکے بھرے سے نکلو ـــ" انھوں نے خوب مذمت کی اور فرضی کہانیاں سنائیں۔ میں جانتی تھی پھر بھی زندگی میں اکثر ایسا موقع آتا ہے سب جان بوجھ کر جھوٹ پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ میری زندگی کا یہ ذہنی موڑ تھا۔ پہلے تو بھیا تمہارا گھنٹوں گن گایا کرتے تھے ـــ لیکن تمہارے جانے کے بعد پل کے نیچے سے ٹنوں پانی گذر چکا تھا ـــ اور کیا۔

تم نے موسیو فلاں کے خط کے جواب میں جو کچھ لکھا مجھے معلوم ہے میں اپنی محبت اور جنس کو دو الگ الگ کبوتروں میں تقسیم نہیں کر سکتا۔ اور اس لئے انھیں دو الگ الگ خانوں میں چھپا کر بھی نہیں رکھ سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر تمہاری بہن سے کیوں، تم سے کیوں نہ عشق کرتا، ہیں؟ ایسا صرف افلاطون کے چشم و چراغ ہی کر سکتے ہیں، اور افلاطون کے چشم و چراغ نہیں ہوتے ہیں۔ جو عشق کرتے ہیں ایک غریب عورت سے اور شادی کرتے ہیں ایک خرد ماغ امیر عورت سے اور عشق اور شادی کے درمیان کا فاصلہ طے کرتے ہیں شغل فرہاد ہی میں اور اپنی دوگنی عمر کی عورت سے جنسی تجربات حاصل کرتے ہیں، جو گھر کی دایہ بھی ہوتی ہے اور زمینداری کا ورثہ بھی۔

پھر تم سے اور بڑے بھیا سے خط و کتابت بند ہو گئی اور تمہاری دوستی ان سے ختم ہو گئی۔ چھوٹے بھیا نے بھی تمہیں لکھا تھا سو آپ سے نفرت کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو آپ کے حوالہ نہیں کر سکتی۔ آپ کا میری زندگی پر بہت انفلوانس تھا، مگر اب نہیں ہے۔"

تمہاری تلخی بڑھ گئی۔ تم نے سمجھا کہ یہ سب کچھ میری مرضی لئے بغیر محض، نہیں میری طرف سے بدظن اور گمراہ کرنے کیلئے کیا جا رہا ہے۔ تم نے خط کی شکل میں ایک کہانی لکھ کر چھپوائی تاکہ تمہارا پیغام مجھ تک پہنچ جائے۔ تم نے مجھے جدوجہد کا پیغام دیا تھا۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم تھا کہ میں بدل چکی تھی۔ میں محبت کا پیمانہ چھپرا تار چکی تھی اور اب میں ایک ریشمیں لباس زیب تن کر چکی تھی۔ اور اب مجھے انجنیئر سے نفرت نہیں تھی اور اب میں انجنیئر کھانا بھی پسند کرتی تھی تمہیں یہ سب کچھ معلوم نہ تھا۔

تم کتے کی طرح اپنی وفاداری سے باز نہ آئے۔ اس دوران میں تمہارا ایک سیاسی رہنما یا سے ملا۔ ابا نے تمہارے خلاف غم و غصہ اور انتہائی نفرت کا اظہار کیا۔ میں اسے ٹیوشن کے بیس روپے دیا کرتا تھا اور وہ چلا تھا میری بیٹی سے عشق کرنے۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، امیں کافی بدنام ہو چکی تھی۔ اور گھر میں چھوٹے بھیا تمہیں گولی مار دینے کی بات کرتے تھے اور اماں سوچتی تھیں کہ پانچ روپے میں کسی غنڈے سے تمہارا سر قلم۔ . . . . لیکن افسوس یہ کہ دور بدل چکا تھا اب تو دوسرے کی کھال ادھیڑنے سے پہلے اپنی کھال کی موٹائی اور چربی کی تہہ بھی ناپنی پڑتی ہے۔

چھوٹے بھیا رانچی گئے ہوئے تھے، تم اس زمانہ میں وہیں تھے تم یونٹی بک شاپ میں بیٹھے ہوئے تھے وہ تمہارے پاس آئے اور انھوں نے تمہیں نمائش دیکھنے کی دعوت دی نمائش میں تم ایک بنچ پر بیٹھ کر بھیا سے باتیں کرتے رہے تھے، تم نے اس روز اپنی ساری تلخی انڈیل کر باہر رکھدی تھی، بھیا چاہتے تھے تم میرا خط واپس کر دو یا اس بات کا وعدہ کرو کہ وہ خط تم میرے ہونے والے شوہر کو نہیں دکھاؤ گے۔ تم نے بھیا کو ڈانٹ دیا وہ میں تمہاری بہن کی طرح نہیں ہوں۔ وہ خط کبھی کسی کو نہیں دکھایا جائے گا۔ ماسو سے کہدو کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مطمئن زندگی گذاریں۔

میں نے محبت کی تھی اور اس نے محض فلرٹ میں مطمئن ہوں اور وہ خوفزدہ۔ میں پھر زندگی کی طرف لوٹ گیا ہوں اور میری دنیا وسیع اور عمل کی دنیا ہے۔ میں زندہ رہوں گا اور ابھرتا رہوں گا ——"

میں تم سے اور شدت سے نفرت کرنے لگی، تم نے اپنی بہن کو لکھا: "اب میری زندگی میں کسی عورت کا تصور نہیں ہے، میں اپنی روح کو تشنہ و محروم رکھوں گا۔ فریب کھاجانے والے خلوص کی یہی سزا ہے — ماسو اپنے طبقہ کی نمائندہ ہے، محبت اس کی تفریح ہے اور فلرٹیشن اس کا حربہ۔ میں اسے اپنی نفرت کے لائق بھی نہیں سمجھتا — اور انتقام، اوہ یہ تو بہت مقدس حربہ ہے یہاں اس کا کیا کام —؟"

کمینے کہیں کے میں غصہ میں پاگل ہو گئی۔ تیرا تو کچھ نہیں بگڑا۔ لیکن میں برباد ہو گیا۔ میں ہوا میں معلق ہوں مجھے کم از کم میری نفرت تو نصیب ہے اور مجھے تو تیری نفرت بھی میسر نہیں، تو مسکراتا ہے تو پائپ پی رہا ہے تیرے بالوں میں زندگی کی گرد جمی ہوتی ہے — تو میری طرف کیوں جھکتا ہے، میں تیری کمان سے نکلا ہوا تیر ہوں۔ اب یہ لب تیرے نہیں، یہ سینہ تیرا نہیں۔ یہ بانہیں کسی اور کی منتظر ہیں، یہ آغوش کسی اجنبی بہار کی راہ دیکھ رہی ہیں یہ آنکھیں کسی اور سورج کے لئے وا ہیں — تو جا، تو چلا جا — انور کے بھوت، تو جا جا، مجھے چھوڑ دے۔

اور پھر ڈھولک کی لہراتی ہوئی زہریلی جھوم جھوم تھاپ . . . . . اوہ کیسا بھیانک تصور ہے۔ کتنا زہر بھرا سپنا — رفیقہ دیکھتی ہے تو انور چلا گیا۔ جب تیری شادی جھوڑ کر دلی آئی تھی کہ پند سور ہو گئی۔ لیکن جگر تو نے میں کس طرح جاگتی رہی رات بھر — تو جانتی ہے کہ میں نے انور سے کبھی محبت نہیں، میں نے تجھ سے سب کچھ کہدیا ہے، وہ جھوٹا ہے، میں نے دولہا بھائی سے بھی کہہ دیا ہے، انوار آوارہ ہے وہ ایک امیر بیوی حاصل کرنے کے لئے مجھے اپنی محبوبہ بناتا ہے۔ اس نے ایک فرضی کہانی لکھی ہے — پڑھے لکھے لوگ آوارہ ہوتے ہیں ادیب اور شاعر آوارہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

لیکن تو نہیں جانتی رفیقہ —— تری تو سہاگ رات ہے۔ میں اسے اذیت میں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ

اطمینان سے میری باتیں سنتا رہا۔ وہ اب پھر اپنی دنیا میں چلا گیا ہے۔ مچھلی سمندر سے نکل آئے تو مر جاتی ہے۔ وہ پھر سمندر میں چلا گیا، وہ اس کے عوام، اس کے ادیب اور شاعر دوست، اس کی امن تحریک، اس کے مزدور اور کسان جن کے بیچ وہ تقریر کرتا ہے اسے گھیرے ہوئے ہیں ایک سمندر کی طرح ـــ اور وہ مسکراتا ہوا جزیرے کی طرح ابھرا چلا جا رہا ہے۔ جیسے سورج مٹھی میں سر اٹھا رہا ہو۔ اندر میں دیکھ رہی ہوں۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں زندگی کے اس سمندر میں ابھرتے ہوئے کتنا حسین جزیرہ ہے اور اس کے اوپر شفق رنگ افق پرچم کی طرح لہرا رہا ہے ـــ اس کے ہاتھ میں ایک نیلا آسمان ہے اور اس کی بے پناہ وسعتوں میں فاختہ اڑ رہی ہے ـــ انسانوں کے الجھے ہوئے سمندر میں پرچم لئے وہ آگے بڑھ رہا ہے ـــ دیکھو وہ کس طرح کہانی لکھ رہا ہے، اس کے بال جھک آئے ہیں اس کا چہرہ سنجیدہ اور شگفتہ ہے۔ دیکھو وہ کس طرح مائک کے سامنے بول رہا ہے ـــ دیکھو وہ اپنے ساتھیوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کس طرح قہقہہ لگا رہا ہے ـــ بتاؤ اب اسے کون مار سکتا ہے ـــ سمندر کی طرح موجیں مارتے ہوئے ہاتھوں پر اٹھے ہوئے اس جزیرے کو کون ڈبو سکتا ہے ابا کے پانچسو روپے، ـــ نہیں ـــ چھوٹے بھیا کا ریوالور ـــ نہیں ـــ وہ سمندر کے حصار میں ہے اور میں ریت پر لوٹتی ہوئی مچھلی ہوں۔

رفیقہ دیکھو روزن سے صبح کی سپیدی پگھل پگھل کر اندر کمرے میں دیواروں پر لوٹ رہی ہے ـــ دیکھا تو نے۔ میری آنکھوں میں اب بھی انور کی مسکراہٹ ناچ رہی ہے ـ یہ مسکراہٹ بول رہی ہے۔ "ماسو تم مجھ سے محبت بھی نہیں کرتی تھیں۔ تم مجھ سے نفرت بھی نہیں کرتی ہو ـــ جو محبت نہیں کر سکتا وہ نفرت بھی نہیں کر سکتا۔ تمہاری محبت بھی طوائف۔ تمہاری نفرت بھی طوائف ـــ اسے بیچا بھی جا سکتا ہے اور خریدا بھی جا سکتا ہے ـــ جاؤ جاؤ ـــ" بتاؤ رفیقہ کیا میں محبت نہیں کر سکتی ـــ کیا میں نفرت نہیں کر سکتی ـــ اے میری زندگی ـــ میری جان ـ میری رفیقہ۔ مجھے اپنے کلیجے سے لگا لے، اپنی سہیلی کو، اپنے اس بدنصیب فریب کو

اے میری مصلوب آرزوؤں کے قہقہہ لگاتے ہوئے جزیرے تو اسی طرح ابھر، اور ابھر ـــ اور ابھر ـــ

ہائے مری بدنصیب محبت بھی دل شکستہ و بدنام . . . . ہائے مری نامراد نفرت بھی پرشکستہ و ناکام ـــ اور پھر ـــ مری زندگی کا یہ ہول، یہ سناٹا، یہ خلا ـــ مری آرزوں کا یہ ویرانہ، یہ خزاں ـــ

اور پھر ـــ

دور سے آتی ہوئی، لہراتی ہوئی ڈھولک کی دہی زہریلی جھوم جھوم تھاپ ـ . . ــ ."

●

اندھی

"ہم جانتے ہو چاول چونتیس روپے من چڑھ گیا ہے۔ کل ڈیوڑھی میں منو چاول بکا ہے آڑھتے آکر کے چار ہے میں دو سو ے لوگ بھی چاول بیچ رہے ہیں۔ بستی سے چاول اٹھ رہا ہے"

کاکا نے بنئے سے کہا ـــ "اور تم نے گنگو کل منو چاول خریدا ہے کیا سچ مچ اکال آئیگا۔ سنا ہے کوریا کوئی دیش ہے جہاں یدھ ہو رہا ہے۔ یدھ تو کوریا میں ہو رہا ہے پھر ہمارے دیش میں مہنگی کیوں ہے"

بنیا ہنسا۔ "یہی ہوتا ہے کاکا۔ آج کے سنسار میں یہی ہوتا ہے جنگ کہیں ہو مہنگی تمام ہی ہوتی ہے جی ـ تم کاہے پڑھتے ہو۔ بدھی تو تم کو ہوگی، پر میں کہتا ہوں یہ اندھیر ہے"۔ "ہاں اندھیر تو ہے ـــ بالکل اندھیر"، سب نے کورس میں کہا۔

انور عظیم

ترجمہ:۔ رامپال

عنکبوت

ہرمینا زور میولن

..... پھر پل پل گہرے ہوتے ہوئے دھوئیں کی جالی سے آنٹ سٹیفی کا تنا ہوا سنگین چہرہ اُبھرتا ہے، اور ایک پُرعتاب آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے، مرلین جاؤ سو جاؤ، مرلین اور دیکھو سونے سے پہلے دعا پڑھ لینا، انشا میریا کمرے کے دور افتادہ گوشے سے بلند آواز میں اس کی تائید کرتی ہیں اور میں اپنے سینے پر ایک گراں بوجھ لئے آہستہ آہستہ چلتی اپنے کمرے میں آتی ہوں، پلنگ کی کانس پر ایستادہ کنواری مریم کے مجسمے کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی ہو جاتی ہوں اور زیر لب شب کی دعا پڑھتی ہوں، موم کی شمع بجھا کر، چادر کھینچ کر پلنگ پر دراز ہو جاتی ہوں، کمرے میں نیند کی پرچھائیں پھیلی ہوئی ہے، لیکن نیند ہمیشہ کی مانند مجھ سے خفا ہے۔ کھڑکی کا دبیز پردہ ہل رہا ہے اور رات کی خوشبوؤں سے بوجھل ہوا میرے نتھنوں میں رینگتی ہے، ایک چنڈول خواب انگیز لے میں اڑتا اڑتا میری کھڑکی کے پاس سے آسمان پر اپنے چاند کی سمت پرواز کر گیا ہے۔ اور میں جاگ رہی ہوں .....

میں جاگ رہی ہوں اور میرا انگ انگ ٹوٹ رہا ہے، آنٹ سٹیفی اور میریا مجھ پر اتنی سختی کیوں کرتی ہیں مارگریٹ سٹر میریا مارگریٹ سچ ہی تو کہتی ہے کہ آنٹ سٹیفی اور میریا بھوت ہیں۔ مرنے سے پہلے وہ بھوت کیسے بن سکتی ہیں بھلا کیسے! لیکن وہ حسین فرانسیسی لڑکی جینی بھی تو یہی کہتی ہے۔ یہ کہن سال عورتیں، میری محافظ زندہ بھوت ہی تو ہیں، اگر وہ انسان ہوتیں تو میں یوں قید میں نہ ہوتی، سوچیں یوں میرے ذہن پر حملہ نہ کرتیں، اور میں بھی جیتے جی اپنے آپ کو زندہ درگور نہ خیال کرتی، جینی کتنی ذہین ہے اور کس قدر حسین، حسین اور پیاری، اور مارگریٹ کا تو جواب ہی نہیں، کانونٹ کی معلم راہبیں بھی اس سے خم کھاتی ہیں، مقدس ماں سیونگ کے سامنے تمام لڑکیاں خوف سے کانپنے لگتی ہیں لیکن مارگریٹ ہے کہ ذرا بھی ان سے نہیں گھبراتی، اور نہایت بے باکی سے گرجا کے آرگن پر مارزرٹ یا بیرلے فاؤنی کی نغمگی بکھیر دیتی ہے۔ ایک دن میں نے بھی گستاخی کی تھی تو وہ مجھ پر بری طرح سے برسی تھی، آخر مجھ پر ہر طرف سے یہ جبر کیوں؟ کسی دن میں آنٹ سٹیفی یا پھر میریا سے یہ سوال کروں گی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے اُن سے اس سوال کا جواب نہیں ملے گا، بعض وقت میں سوچتی ہوں، میں اپنے مالی جان سے یہ کیوں نہ پوچھوں، بیچارہ بڑا اچھا آدمی ہے، اور مجھ سے بے حد پیار کرتا ہے، کوئی بھی مجھ سے پیار نہیں کرتا، اور جان کی شفقت مجھے عجیب سی لگتی ہے، باغیچے میں چاندنی میں سبزے پر لیٹے ہوئے اشجار کے لرزتے ہوئے سایوں کی مانند، جان کہتا ہے، میں بڑی ہی پیاری ہوں اور معصوم مجھے بھی سمجھتا ہے نا، اِن کھوسٹ بوڑھیوں کی طرح، پھر بھی وہ مجھ پہ مہربان ہے، وہ ان سے مختلف ہے۔ شاید اسی لئے وہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ سٹیفی نے مجھ سے کہا تھا حسب معمول اپنے تند لہجہ میں، مرلین جان سے اتنا مت گھلو وہ اپنے طبقہ سے نہیں، اپنا طبقہ، اور مجھے آنٹ میریا کے وہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں، اپنا طبقہ، اس سُرخ شعلے کی مانند ہے، جو اپنی لگائی ہوئی آگ میں خود ہی جل رہا ہے، اور تپش نہیں دیتا، کتنے معنی خیز ہیں آنٹ میریا کے یہ الفاظ، آنٹ سٹیفی کا چہرہ ایک لمحہ کے لئے پیلا پڑ گیا تھا، میں یہ سوال جان سے نہیں پوچھوں گی، کل ابا مجھے لینے آ رہے ہیں، میں اُن سے

یہ سوال کروں گی، یہ اور دوسرے ان گنت سوال، جو میری روح کی اُلجھن بن چکے ہیں، میرے دل کا روگ اور . . .

* * *

. . . ابا گاڑی سے اتر رہے ہیں، اور آنٹ میریا، اور سٹیفی ان کا استقبال کر رہی ہیں۔

جوزف، جوزف تم کیسے ہو؟

اچھا ہوں سالخوردہ جوزون . . .

ہش مرلین دہلیز پر کھڑی ہے۔

تمہاری عادتیں نہیں بدلیں،

اور . . . . مرلین آؤ ابا سے ملو . . . اور میں اسکرٹ سنبھالتی ہوئی بھاگ کر ابا سے چمٹ جاتی ہوں، ایک طویل سے طویل تر لمحے کے لئے یہ بھول جاتی ہوں، کہ آج میرے ہوش میں پہلی مرتبہ آنٹ سٹیفی اور میریا نے جاذب نظر کپڑے پہنے ہیں، اور رات ہی رات میں گھر کی، بچے کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور یہ قید خانہ چھتی یا پھر مارگریٹ کے والدین کا حسین نگار معلوم ہوتا ہے، جادو کا کوئی محل، جو ابا کے قدموں کے لمس سے برسوں کی قید سے آزاد ہو گیا ہے، جگمگا اٹھا ہے، زندگی کے نور سے، حرکت سے، تعطر سے، اور یہ عورتیں، اصل میں دوشیزہ لڑکیاں ہیں، اور . . . . ابا زور سے مجھے اپنے ساتھ دباتے ہوئے کہہ رہے ہیں، سات سال کی قلیل مدت میں میری ننھی کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ میری مرلین جوان ہو گئی، جوان خوبصورت اور پیاری، . . . اور وہ میرے بالوں پر ایک طویل بوسہ دیتے ہیں، ایک طویل گرم بوسہ میرے رگ و پے میں تیرنے لگتا، میرا دل ایک نئے انوکھے انداز سے دھڑکنے لگتا ہے، میں بچی نہیں ہوں، جوان ہو گئی ہوں، جوان، خوبصورت اور پیاری، کتنے رسیلے بول ہیں یہ، اور کس قدر خواب آگیں، میں آسمانوں پر اڑی جا رہی ہوں، ستارے میری گردِ راہ ہیں، اور . . . .

* * *

میری انگلیاں پیانوں کے پردوں پر تیر رہی ہیں، اور میرے ہونٹوں سے بے تحاشا نغمۂ بہار ایک دلکش سوتے کی طرح پھوٹ رہا ہے، موزرٹ کا ایک پر ساد نغمہ، اور ابا میری تعریف کر رہے ہیں، وہ آنٹ سٹیفی اور میریا بھی۔ میں ایک قیدی نہیں ہوں میں آزاد ہوں، ہواؤں کی مانند، بادلوں کی طرح . . . . معاً ابا میری پیشانی پر ایک بوسہ دیتے ہیں۔ پھر مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا کے صوفے پر اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں، ایک ہاتھ میری پشت پر ڈال کر مجھے اپنے ساتھ دباتے ہوئے . . . نئے پیرہن میں ملبوس میریا اور سٹیفی سے باتیں کرتے ہوئے، ان کی باتیں سیدھی سادھی، اور صاف ہیں، اور ایک طرح سے میری ذہنی الجھنوں کا حل، وہ آنٹ سٹیفی سے کہہ رہے ہیں، اپنے طبقے کا وجود ختم ہو چکا ہے سٹیفی، اشرافیہ مر رہے ہیں، لیکن شرافت پسند زندہ ہیں، انھوں نے درمیانی طبقے کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو چھپا لیا ہے۔ ابا کہتے ہیں، پھر مجھ پر جھک جاتے ہیں، مجھے پیار کرتے ہیں اور ان کی جانب دیکھتے ہیں، دونوں بوڑھیاں ابا کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں، کتنی چالاک ہیں وہ، دو دن کی قلیل مدت میں ہی بدل گئی ہیں، مجھ سے بھی اچھا سلوک کرتی ہیں، اور جان سے بھی۔ کل تک ایک رذیل کیڑا، آج ان کی نظر میں انسان بن گیا ہے، آیا سمجھ بھی تو سکتے ہیں، یہ چالاک بوڑھیاں ہیں

* * *

گاڑی چل رہی ہے، اپنے پیچھے اسٹیشن کو چھوڑ کر، پلیٹ فارم پر ایستادہ تین سایوں کو چھوڑ کر آنٹ سٹیفی

اور میرپا کے جنگل سے میں بجانے کب سے نکلنا چاہتی تھی، اور اگر مجھے۔ میرا مطلب ہے۔ مجھے کوئی غم ہے تو صرف یہ کہ اب جان سے کبھی نہیں مل سکوں گی، پیارے جان اسے لیکن، یہ آزادی، ابا کا قرب، اور نئی حیات، اتنی بڑی خوشیاں ہیں جن پر ہر ایک چیز قربان کر سکتی ہوں، میں اس جادوانی وقت کا انتظار ایک مدت سے کر رہی تھی اور اب میں بہت خوش ہوں، اور . . . گاڑی اب اپنی پوری قوت سے چل رہی ہے اپنے پیچھے اس چھوٹے سے شہر کو چھوڑتی، سکو نزگ کے منحوس گرجے کو، اور کاؤنٹ کو بھی پیچھے چھوڑ کر، تھوڑی سی دیر میں سرحد آجائے گی، اور ہم جنیوا میں ہوں گے، ایک حسین ترین شہر میں، اور بج ہوٹل میں ٹھہریں گے، اور دو دن جنیوا میں ٹھہر کر اٹلی چلے جائیں گے عظیم لیڈروں کے دیس میں، پاپاؤں کے وطن میں دور . . . .

★

ہم ہوٹل بج میں مقیم ہیں، ہمارے پہلو کے کمرے میں ابا کی ایک دوست ٹھہری ہوئی ہے، وہ بےحد حسین اور جاذب نظر عورت ہے، اس کا نام ہے توزی، آنٹ توزی، بڑی ہی بےباک عورت ہے جب وہ پہلے پہل ہمیں ہوٹل کے لانگ میں ملی تو اس نے چھوٹتے ہی کہا، ہیلو اولڈ سنر، میں نے چونک کر ابا کی سمت دیکھا تو وہ دوسری سمت دیکھ رہے تھے، اور ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا، وہ منہ موڑے ہوئے کہہ رہے تھے، میری بچی امیلین سے ملو، اور . . . . توزی بھی یکبارگی خاموش ہو گئی تھی، اور . . . . اس نے ابا کو پرانا گنہگار کیوں کہا؟ گنہگار کسے کہتے ہیں، ایسے کتنے ہی سوال میرے دل میں پیدا ہوئے، اور جب رات گئے ہم تنہا اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑے تھے تو میں نے ابا سے کہا کہ توزی نے انھیں گنہگار کیوں کہا تھا، ان کا چہرہ زرد کس لئے ہو گیا تھا، اور گنہگار کسے کہتے ہیں؟ انھوں نے میرے کسی سوال کا جواب نہ دیا، اور چپ چاپ کھڑے رہے، بےحس و بےجان، میں نے اصرار کیا، تو انھوں نے تلخی سے کہا، مجھے تنگ نہ کرو، تم ان باتوں کو سمجھ نہیں سکو گی۔ — تم بچی ہو، تم . . . .

پھر وہی بات کہ میں بچی ہوں، اور ابا! میرے ذہن میں پھر سائے رینگنے لگتے ہیں، آنٹ توزی کون ہے؟ ابا سے اس کا کیا تعلق ہے . . . میں پاگل ہو جاؤں گی، پاگل . . . .

یہ سوچتے سوچتے میں چلا اٹھتی ہوں، اور ابا متوحش نظروں سے میری جانب دیکھتے ہیں، مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیتے ہیں، اور میرے بالوں پر ایک طویل بوسہ دیتے ہیں، ایک طویل بوسہ، لیکن اس بوسے میں گرمی نہیں، حرارت نہیں، خلوص نہیں، ابا ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں، مجھ سے اپنی امیلین سے اور . . .

مجھے اب اس کا یقین ہو گیا ہے کہ ابا بعض معاملات پر مجھ سے بات چیت نہیں کرنا چاہتے، پھر میں یہ بھی تو جان گئی ہوں کہ کیوں؟ ابا اپنے وقت کے ڈان جان، لوہیمین رہے ہیں، اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بچی کو ان کی پرانی زندگی سے کوئی عکس مل سکے وہ کتنی بڑی بھول میں مبتلا ہیں، میں ان کی پرانی زندگی سے کیسے متاثر ہو سکتی ہوں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں، میں کیا جاننا چاہتی ہوں، اچانک میرا ذہن شل ہو جاتا ہے، منجمد، میرے ارد گرد تیرگی محیط ہو جاتی ہے، اور . . . .

★

ہم اٹلی پہنچ گئے ہیں، اور ہم روم کے ایک رہائشی ہوٹل میں مقیم ہیں، ابا نے میری دیکھ بھال کے لئے ایک گورنس نکالی ہے، بلینا یہ اس کا نام ہے، وہ بہت اچھی اور پیاری ہے، اور ابا، ابا بھی جب سے مجھ پر عنشی کے دورے پڑے زیادہ وقت مجھے دینے لگے ہیں، گھر پر بھی، اور باہر بھی، اور وہ مجھ سے مسلسل باتیں کرتے ہیں، اپنی امی، رشتہ داروں،

نئے شہروں اور دنیا کے عجائبات کی اور وہ نہایت چالاکی اور سلیقے سے ان باتوں سے پہلو بچا جاتے ہیں جن کا تعلق میری الجھنوں سے ہے، آخر وہ ایک سابقہ ڈپلومیٹ ہیں نا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھی بعض اوقات انجانے میں وہ میری موجودگی میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں، جو میں جاننا چاہتی ہوں، اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا، شاید وہ اس وقت جذبات کی رو میں ہوتے ہیں، یا جوش میں، یا پھر وہ اپنے ساتھیوں کو چڑانے کے لئے ایسا کرتے ہیں، اور ۔ ۔

ان کے ساتھی، تین سابقہ ڈپلومیٹ ہیں، پہلا ڈپلومیٹ انگریز ہے، دوسرا جرمن اور آخری ایک فرانسیسی ہیں انگریز ڈپلومیٹ سر جان فریبی کو بہت پسند کرتی ہوں، ان کے بال برف کی مانند سپید ہیں، اور رخسار تازہ گلاب کی طرح شہابی، ان کے پیکر سے جلال برستا ہے، بٹیا کے خیال میں وہ پرلے درجے کے رجعت پسند ہیں، ایک بدترین ڈیتھ ہارٹ وہ کچھ بھی ہوں بڑے ذہین ہیں، اور صرف اس وقت جوش میں آتے ہیں، جب دوران گفتگو میں اتفاقاً برطانوی لیبر پارٹی کا تذکرہ چل پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ "یہ لوگ، یہ لوگ اکھڑ دل اور مانع روشن ہیں، ان کی جبین پڑ ہیں، اسی لئے وہ ذہین ہیں اپنے خیالوں میں ناگزیر مسائل کو جنم دے کر وہ ان لوگوں سے کھیلنا چاہتے ہیں، جن کی جبینیں ان کی مانند پرُ ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ایک عام آدمی بھی ان کی مانند سوچے، وہ خالی الذہن بھوت ہیں، جو کبھی نہیں مانتے کہ وہ وقت سے پہلے مر چکے ہیں، ابا اکثر کہتے ہیں جنگ عظیم انسانیت کے خلاف ایک سنگین جرم تھا، سر جان فریبی جنگ عظیم کو ایک احمقانہ غلطی کہتے ہیں، وہ باقیوں کی مانند انتہائی مہذب نہیں، لیکن پھر بھی وہ دوسروں کی باتوں کے کمزور پہلو کو جھٹ بھانپ جاتے ہیں، سر جان فریبی کا صرف ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے ہندوستان، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے خلاف ہیں اور سنجیدگی سے یہ کہتے ہیں کہ اس برعظیم میں انارکی پھیل جائے گی، اگر انگریز ہندوستان سے چلے آئے تو، انکا کہنا ہے کہ اس ملک میں انسان نہیں بستے، بلکہ وحشی ہندو، مسلمان، دوسرے ان گنت جنگی قبائل، جنہیں انگریزوں نے اپنی ہمہ گیر قوت، اپنے ارفع تدبر سے دبا رکھا ہے، اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ان لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ ایک دوسرے پر پل پڑیں گے، اس ملک کے ہندو اور مسلمان نہ صرف ایک دوسرے کو ذبح کر ڈالیں گے بلکہ انسانیت کو بھی، وہ عورتوں کی بے حرمتی کریں گے، کھلے بندوں بچوں کو سنگینوں پر اچھالیں گے کیوں؟ معاً میرے رگ و پے میں سوئیاں چبھنے لگتی ہیں، میری آنکھوں میں بجلیاں لہراتی ہیں، میرے ہونٹ کانپتے ہیں، میں سر جان فریبی کو ٹوکنا چاہتی ہوں، وہ جھوٹ بول رہے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ کیوں وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ انکا غلام بنا رہے، تاکہ ان کے ہموطن اس غلام دلیس کو دیوالیہ بنا ڈالیں اور ۔ ۔ ۔ میں تیز تیز نظروں سے ان کی جانب دیکھتی ہوں، اور چپ رہتی ہوں، یہ ان کی مرتی ہوئی فطرت ہے، وہ اپنے وطن کے آزاد خیالوں کے مخالف ہیں، دوسرے بھی فرانسیسی اور جرمن ڈپلومیٹ اس سلسلے میں ان کے برابر کے ساتھی ہیں، اور اب حزب مخالف میں ہیں اور انھیں چڑانے کے لئے ہمیشہ دنیا کی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتے ہیں، نئے روسی نظام کے متعلق انھیں لیکچر پلاتے ہیں، اور موسیو لی فی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

موسیو لی فی ٹھگنے قد کے فرانسیسی ہیں، ان کی آنکھیں گہری، شب رنگ ہیں، اور وہ ہمیشہ اپنی مادری زبان ہی میں گفتگو کرتے ہیں، انھیں سر جان فریبی اور جرمن برواں ڈنخن برگ سے شدید نفرت ہے، لیکن اس کے باوجود وہ دونوں کو برداشت کرتے ہیں، اس لئے اس مسئلہ میں وہ ان سے متفق ہیں کہ اگر وہ اپنی اپنی حکومتوں کے لیڈر ہوتے تو جنگ عظیم کبھی نہ ہونے دیتے۔ وہ اس بات کو، مردہ آرزو کو اتنی بار دہراتے ہیں کہ مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔ جنگ عظیم آخر ایک تاریخی تقاضہ تھا، پھر کل ہی تو ابا نے موسیو لی فی کو ٹوکا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

موسیو آپ غلطی پر ہیں، ہم خلوص سے کچھ نہیں چاہتے تھے، ہم صرف سوچتے ہی رہے، اور جنگ عظیم نے ہمیں بتایا ہم دوسرے ملکوں میں اپنے ملکوں کے سفیر تھے یعنی نا حکومتوں نے ہمیں سفیر مقرر کیا، اور ہم سفیر بن گئے، اور ہم یہ بھول گئے کہ اپنے وطن کے تئیں ہمارے ذمے کچھ فرض ہے، اور ساتھی سفیروں کی حسین دلہنوں کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرتے رہے اگر اس سلسلے میں کامیاب ہوگئے تو ہم نے سوچ لیا کہ ایک حسین اپنے پہلو میں ہے اور باقی سب اچھا ہے۔۔

ہروان ڈنجن برگ تلملا اٹھے۔

آپکا اشارہ غالباً آسٹرین سفیروں کی طرف ہے، ہم جرمن اپنے فرض سے کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔

آپ ۱۹۰۵ء میں لینن گراڈ میں تھے نا۔

میں سینٹ پیٹرز برگ میں تھا۔

ابلانے ایک بلند وطویل قہقہہ لگایا۔

سرجان آپ کی زبان میں اس شہر کو کیا کہتے ہیں؟

سرجان مسکرائے۔

پیٹروگراڈ۔

موسیولی فو نے سرجان کے ساتھ ساتھ دہرایا

"سینٹ پیٹرز برگ"

ابلانے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم ایک شہر کے نام پر بھی اتفاق نہیں کر سکتے، اگلے وقتوں کے لوگ ہیں یا ہم لوگ!

ہروان ڈنجن برگ تنے؟

تم جو دل میں آئے کہو، پھر بھی مجھے اس کا یقین ہے کہ ابھرتا ہوا درمیانہ طبقہ ذہانت میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

سرجان فریبی بولے،

پھر ان کی منزل بھی تو متعین نہیں، ہم اس ایک جماعت کے باقی ماندہ انسانوں کی ترجمانی کرنے میں ہیں جس نے صدیوں پر اپنا پرچم لہرایا ہے، ہم نے طاقت کی انتہا دیکھی ہے، اور درمیانہ طبقہ ہے کہ عروج حاصل کرنے سے پہلے ہی زوال پذیر ہو گیا ہے۔ اور اس زوال کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ درمیانہ طبقہ نے ایک طرف تو ہماری تقلید کی کوشش کی ہے، اور دوسری سمت صرف کمرشیل ترقی پر بھروسہ کیا، آخر اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔۔۔۔

موسیولی فو نے انکا تضاد پیش کیا۔۔

درمیانہ طبقہ کے سامنے ایک عظیم الشان استقبال ہے،

"اور ہروان ڈنجن برگ نے کہا

اشرافیہ کو بھی بہت سی فتوحات کرنی ہیں، جرمن اشرافیہ کو خاص کر

اگر میں اس سے اختلاف کرتے ہوئے یہ کہوں کہ جرمنی میں اصل طاقت بڑی انڈسٹری کے ہاتھ میں ہے

اور مستقل۔۔۔۔۔

موسیولی فو نے ہروان ڈنجن برگ آپ اپنے اپنے نظریات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

۔۔اور کونٹ تنکن بیلڈ آپ تو بقول خود مطعون و مرتد ہیں

ہروان ڈیجن اب بیچ میں طیش میں آگئے تھے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے، اور ایک دن آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم اشراف دنیا کی آج کی تاریخ کے:.
گگلو (Gigolo) ہیں۔

ابا نے بیزاری سے بات کاٹتے ہوئے کہا،
موسیولی فو نے ایک بلند و طویل قہقہہ لگایا، لیکن ہروان ڈیجن برگ اور جان فریسی خاموش رہے، غالباً وہ گفتگو کو سنجیدگی سے لے رہے تھے اور جب چاپ فضا میں موسیولی فی کا تیز، بلند و طویل قہقہہ گونج رہا تھا اور ایک لفظ گگلو . . . ،

میں سوچ رہی ہوں گگلو کے کیا معنی ہیں، کاؤنٹ کی استانیوں نے دنیا اور آسمان کی تاریخ پر ہمیں لیکچر دیتے ہوئے دنیا کی تاریخ سے گگلو انسانوں کے متعلق کچھ نہیں بتلایا، اشرافیت پر طویل لیکچروں کے دوران میں انھوں نے کہا تھا کہ اشرافی ہونا ایک بڑا، بہت بڑا اعزاز ہے" اور عام زندگی میں ایک اشرافی کے معنیٰ ہیں، بلند خیال، خوش سلیقہ، اور ہر مقدس معلمہ نے اس موضوع سے چشم پوشی کی ہے کیوں؟ انھوں نے ہمیں آسمان کی سلطنت کی تنظیم پر بیکار لیکچر دیئے ہیں ہم سے کہا ہے کہ خدا کے نزدیک منتخب لوگوں کا کیا رتبہ ہے، راہب اور پادری عظیم ہیں، یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر انھوں نے ہمیں اس بات کی تعلیم کیوں نہیں دی کہ ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہے، اس سیارے سے انسان کا ازلی و ابدی تعلق ہے، میں سوچتی ہوں کیا یہ ایک عظیم غلطی نہ تھی، آسمان پر جانے سے پہلے انسان دوسرے ان گنت انسانوں کے ساتھ اس بلند و برتر سیارے پر رہتا ہے، آخر اس دھرتی سے ان کی دشمنی کیوں ہے؟ انسان انسان سے کیوں نفرت کرتا ہے، انسان، انسان کو وحشی کیوں کہتا ہے، اس کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے یہ اور دوسرے بیسیوں سوال، طویل گراں بار سائے مجھ پر پھیلتے ہیں یہ مجھے ڈستے ہیں، میرے انگ انگ میں زہر پھیلا دیتے ہیں۔ اور پھر میں تنہا بیٹھے بیٹھے چیخنے لگتی ہوں، چلانے لگتی ہوں، میں ابا سے، ہر جان فریسی سے، موسیولی فو، ہروان ڈیجن برگ، آنٹ سٹیفی، میریا اور کاؤنٹ کی مقدس ماؤں سے یہ سوال کرنا چاہتی ہوں، اور میرا دماغ پھٹ جاتا ہے، میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے اور میں روشنی کی جستجو میں تاریک کھڈوں میں گر پڑتی ہوں، ابا مجھے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن میں نیچے ہی گرتی چلی جاتی ہوں، اور . . . .

پھر آسمان سے آسمانوں تک، بحریں سے بحریں تک، دھرتی سے دھرتی تک، خموشی محیط ہو جاتی ہے گہری طویل خاموشی، موت کے طویل شہپروں کی سنگین خموشی . . . . . ؛

●

پیشہ

بیردھان بابو چونک اٹھے۔ ان کے سامنے خمیدہ کمر کا ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ پچکے گال، اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کا سیاہ فام انسان جسے انھیں نے بارہا منڈی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ اسکے آگے سارے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ اسکے منھ سے تیز بد بو آرہی تھی غالباً وہ مدکی یا چرس تھا، انکا جی متلا گیا۔
کنوارے بابو سے چودھری کہہ رہا تھا — "ارے بھائی بیردھان اپنے ہی آدمی ہیں —" " پھر بھی" "شبہ نہ کرو" انکا ارادہ بھی چادر بدلنے کا ہے" — "تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا" چودھری نے اطمینان کا سانس لیکر کہا — یہ پیشہ ہی ایسا ہے کنوارے بابو — جانے کا مدھ کے بھیس میں کوئی غم غا آجائے پھر — کوئی یہ پیشہ جان بوجھ کو تھوڑے ہی اختیار کرتا ہے — " رامپال

قاضی نذر الاسلام
ترجمہ: یونس احمر

نیا سویرا

(بنگالی نظم)

پکارتا ہے کون آج ؟

۱ —
چلو فتح کی رتھ چلی
سفر شروع ہوا ابھی
یہاں تمہارے واسطے
رہیگی بزمِ دل کھلی

۲ —
چراغ رہ جلاؤں گا
سجا کے ایشیا یہ مکاں
نگاہیں کھول دیکھ لو
اِدھر اُدھر حسیں نشاں

۳ —
اڑا کے گرد پاؤں سے
چلا ہے آج کارواں
جنوب کی ہواؤں میں
نہاں ہے زندگی نہاں

شب سیہ چمک اٹھی
کلی کلی مہک اٹھی

۴ —
گزر رہا ہے دم بدم
جلوس اسپ و فیل
اُدھر ہے پرچم حیات
بلندیوں سے جھانکتا

۵ —
یہ کھیت حسین دھان کے
مہک اٹھے ہواؤں سے
خوشی کے نور آؤ تم
نیا سویرا لاؤ تم

احمد ظفر

لام تے امن

(پنجابی نظم)

ترجمہ:۔ شفیع عقیل

چھم چھم چھم چھم نیر بہاوے پھلاں ورگی ناری — دور دوراڈے کجھ نہ دِسے رات ہوئی اے بھاری

پھولوں کی طرح (خوبصورت) ناری چھم چھم آنسو بہا رہی ہے — دور دور تک کچھ دکھائی نہیں دیتا اور رات گذارنا مشکل ہو رہا ہے

ڈالی ڈالی بھولے پنچھی کوکن تے کرلاون! — سُونیاں گلیاں سُنجے کوٹھے دل دا خوف ودھاون

ڈالی ڈالی بھولے بھالے پنچھی رو رہے ہیں — سنسان گلیاں اور سنسان مکان دل کا خوف بڑھا رہے ہیں

بیلے بیلے سپّاں دی شوکر دل نوں ڈس ڈس جاوے — کالا بھور غضب دا بدّل پل پل وس وس جاوے

جنگل جنگل سانپوں کی پھنکار دل کو ڈس رہی ہے — اور غضبناک سیاہ بادل پل پل میں برس رہا ہے

بیلی بیلی اُجڑ گئی تے کھوہ مالاں ٹُٹ گیاں — دھرتی دے سینے چوں نہراں خون دیاں پھٹ پیّاں

کھیت ویران ہو گئے ہیں کنوئیں کے ڈول ٹوٹ چکے ہیں — (اور) دھرتی کے سینے سے خون کی نہریں پھوٹ پڑی ہیں۔

چاچا بابا کردے پھردے رودن بال ایانے — لہندے چڑھدے ویکھ ویکھ کے چپ چپ ہوئے سیانے

چھوٹے چھوٹے معصوم بچے چاچا اور بابا پکار رہے ہیں — (اور) دانا لوگ پورب پچھم کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے ہیں

پنڈ پنڈ راتاں چاننیاں آ آ لنگھ جاون — اُڈ پُڈ گئے رنجھیٹڑے تے ہیراں کانگ اُڈاون

دیہاتوں میں چاندنی راتیں آ آ کر گذر رہی ہیں — رانجھے (عاشق) نہ جانے کہاں چلے گئے کہ ہیریں (محبوبائیں) کاگ اُڑا رہی ہیں

بندوقاں تتیاں گھمن گولیاں تڑ تڑ تڑ تڑ وسن — کتھاں اجڑے پُجڑے لوکی ایدھر اودھر نسن

لام تے امن

احمد ظفر

بندوقیں گرج رہی ہیں تڑ تڑ گولیاں برس رہی ہیں (اور) لاکھوں بے خانماں لوگ ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں

ایہہ بربادی ایہہ ویرانی فیر نہ ہون دلیاں — کل روئی سی دنیا اوہنوں اج نہ رون دلیاں

بربادی یہ ویرانی میں پھر نہیں ہونے دوں گا — کل دنیا روئی تھی مگر آج میں اسے نہیں رونے دوں گا۔

★

رنگ رنگیلے چرخے گھوکن امن دی گھگی بولے! — جندڑی پیلاں پاندی جاندی پھٹ پرانے مولے

رنگ رنگیلے چرخے چل رہے ہیں امن کی سیٹیاں بج رہی ہیں — زندگی خوشی میں جھوم رہی ہے۔ پرانے زخم مندمل ہو گئے ہیں

اچیاں لمیاں بانکیاں ناراں گیت خوشی دے گاون — وانگ پھلاں دے کھڑ کھڑ ہسن ہس ہس تے شرماون

اونچے لمبے قد والی دوشیزائیں خوشی کے گیت گا رہی ہیں — پھولوں کی طرح ہنس رہی ہیں اور شرما رہی ہیں۔

ساویاں پیلیاں چنیاں لے کے فصلاں وہٹیاں جلیاں — بیری بیری بور لشکدا جیوں ہیرے دیاں کنیاں

ہرے، پیلے دوپٹے لیکر فصلیں دلہنیں بن گئیں۔ — بیری کے درختوں پر بور ایسے چمک رہا ہے جیسے ہیرے کی کنی چمکتی ہو

نماں نماں چن دا چانن گجیاں گجیاں گلاں!!! — مٹھڑے مٹھڑے بول پیار دے جیوں راوی دیاں چھلاں

مدھم چاندنی ہے اور پیار بھری راز کی باتیں ہیں — محبت کے میٹھے بول دریائے راوی کی لہروں کی طرح دھیمے ہیں

کدھرے کدھرے کوڈے کھیڈن کدھرے کوڈے پتے — کدھرے کوئی ہیر سناوے کدھرے کوئی ٹپے

کہیں کوئی آنکھ مچولی کھیل رہا ہے کہیں کوئی کوڑیوں اور تاش کھیل رہا ہے — کہیں کوئی ہیر سنا رہا ہے اور کہیں کوئی ٹپے گا رہا ہے۔

دانے وانے بڈھے نڈھے رل مل بہندے — اک دوجے دے دل دی سن دے اک دوجے نوں کہندے

چوپال میں بوڑھے اور جوان آپس میں مل جل کر بیٹھے ہیں — ایک دوسرے کے دل کی بات سن رہے ہیں اور اپنے دل کی سنا رہے ہیں۔

فصلاں وڈن اجڑ چارن گاواں مجھاں چو ون — رات پوے تے تھکے ٹٹے مٹھی نیندر سو ون

فصلیں کاٹ رہے ہیں، مویشی چرا رہے ہیں اور گائے بھینسوں کا دودھ دوہ رہے ہیں (اور) جب رات آتی ہے تو تھکے ہارے میٹھی نیند سو جاتے ہیں

★

دور دلاں دے جنگ دے ہو دن دور بلائیں نسن — امن دے مٹھے سائے ہیٹھاں جگ جگ لوکی ووسن

کاش! جنگ کے دلدار ہمیشہ کیلئے دور ہو جائیں بلائیں دور بھاگ جائیں — اور لوگ امن کے میٹھے سائے تلے ہمیشہ چین سے رہیں بسیں

مشتاق میرپوری

بکتی رہیں گی

ترجمہ۔ ڈیپلائی

(سندھی نظم)

دنیا میں بکتی رہیں گی، ہزاروں چیزیں، محبت، پیار، دُکھ درد، خوشی، راحت، حسرتیں، ارمان، تقدیر و تدبیر۔
ہر قیمت پر بکتی رہیں گی۔
جب تک ـــــ تو، میں اور سب خاموش رہیں گے۔

●

خودداری، بیدار،
خودداری، بیداری بے بسی، بیاروں کے ہاتھوں، بے حس نوجوانوں کے ہاتھوں جاہل نادانوں کے ہاتھوں
بکتی رہیں گی۔
طاقتیں، قوتیں، سرکشی کی، سربلندی کی اور سرفرازی کی
جب تک ـــــ تم، میں اور سب خاموش رہیں گے۔
ہر جگہ بکتی رہیں گی۔
نزاکتیں، دلکشی، دلبری، جوانی کے سودوں میں، ظاہری نمائش میں، رسم و رواج کی قتل گاہوں میں، ارزاں اور ذلیل
ہوتی رہیں گی، زندگیاں اور عمریں،
جب تک ـــــ تو، میں اور سب خاموش رہیں گے۔
ظالم جابر، بے رحم ریاکار حاکموں، ساہوکاروں، زمینداروں کے محلاتوں، بنگلوں اور آفسوں کے دروازوں پر
بکتی رہیں گی۔
محنتیں، قسمتیں، عزتیں اور عصمتیں۔ جب تک ـــــ تو، میں اور سب خاموش رہیں گے۔

●

نگاہیں خوشیوں سے محروم، نظاروں سے بے پروا، زندگی سے دور، پگڈنڈیوں اور شاہراہوں پر، ہزاروں کانٹے چبھتے
رہیں گے، جن کی نوکوں پر بکتی رہیں گی ـــ ناچاریاں، غربتیں، اور مصیبتیں۔
جب تک ـــ تو، میں اور سب خاموش رہیں گے
ظاہر میں پوشیدہ ہیں، یہاں وہاں، ہر جگہ، فریب و مکر سے بکتی رہیں گی۔
قوت کی کارفرمائیاں، طاغوتیت اور ہوس کی عظمتیں، چمن، گل، خوشبو، غنچے پتے، ڈالیاں، کونپلیں، بلبلیں
اور وہ بیاں! تمہارے سرداروں کی تعریف ہی کیا۔ بکتی رہیں گی۔
دنیا کی ہزاروں چیزیں اور لاکھوں جنسیں ـــ جب تک ـــ اے دوست ـــ تو، میں اور سب خاموش رہیں گے۔

سفرایت کن — ترجمہ: عبدالعزیز خالد

بہار آئی

(ترکی نظم)

سنہری کونپلیں پھوٹیں
فضاؤں میں تمہارا نغمہ لہرایا
در و دیوار پہ ہے سبزۂ نورستہ کا جوبن
مہک اٹھے گل و گلشن
فضاؤں میں تمہارا نغمہ لہرایا
شبستاں ہو گئے روشن
کسانوں کی مشقت رنگ لے آئی
کھلی سرسبز فصلیں لہلہا اٹھیں
سرِ صحرا سمن زاروں کا منظر ہے
جواں جذبات کی ہلچل سے سرمست نوا ہو کر
فضاؤں میں تمہارا نغمہ لہرایا
گرسنہ چارپاؤں نے وہ سبزہ کھا لیا سارا
ہوائے زمہریری نے
لباس رنگ و بو کو چھین کر یکسر
چمن کو کر دیا ننگا
درانتی کے مہیب تیز دانتوں نے
زمرد فام فصلوں کو چبا ڈالا
خزاں آئی
زمستانی ہوا کے سرد جھونکوں میں
اداس افسردہ یخ بستہ فضاؤں میں
تمہارے آتشیں نغموں کی مستانہ نوائیں اب بھی ابھریں گی!

قومی نغمہ — ترجمہ: ادیب سہیل

نئی زندگی

(تاجکستانی)

مسرت کی آواز سے گونجتے ہیں
تمہارے یہ کوہ و دمن تاجکستان
حیات آفریں اور ضیا پاش کرنوں سے
معمور سرو و سمن تاجکستان
زمانہ ہے تمہاری خوشی کا زمانہ
تمہاری فضاؤں میں جلوہ نما ہے
بلند حوصلہ اور عزائم بداماں
جری اور آہن بدن تاجکستان
تم اپنے جیالے سپوتوں جوانوں
کے حسنِ عمل کا کرشمہ تو دیکھو
ہے معدوم بند و سلاسل کی سختی
نگوں سر ہے ہر زعمِ رسنِ تاجکستان
وہ صدیوں کی محکومیوں کی سیاہی
میں دیکھو جمالِ سحر کا نظارا
تم آج آپ ہی ہو نگہبان اپنے
گئے تاجدارِ کہن تاجکستان
تمہیں نے تو مشرق کی جنتا یہ کھولیں
نئی زندگی کی مقفل کواڑیں
تمہیں نے تو بخشا ہے زندہ دلوں کو
نئی زندگی کی لگن تاجکستان

محمد صالح تنہا تھانوی

موسمی نثر پارہ

مزارِ اقبالؒ پر

جون کا مہینہ ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ برصغیر ہند کو عبور کر کے سرحد پاک میں داخل ہونے والا ایک برمی مسلم جرنلسٹ لاہور کے شاہی قلعہ کے پھاٹک سے گزرتا ہوا، ایک سنگ سرخ کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت کی طرف بڑھ رہا ہے، شرفاء لاہور کے خاندان کا صلاح الدین نامی ایک نوجوان ساتھ ساتھ ہے، قدموں میں تیزی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں زینے کو طے کرتے ہوئے اس عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ ادب و احترام کی نظریں اٹھیں، ان کے قدم رُک رُک کر اٹھنے لگے، انکے چہرے انکی دلی کیفیت کی غمازی کر رہے تھے ـــ کیوں نہ اُن پر وجدانی کیفیت طاری ہو جبکہ نووارد ہزاروں میل دُور سے زحمت سفر برداشت کر کے یہاں تک پہنچا ہے، اور جس کی سالہا سال کی غائبانہ عقیدت، اور شوقِ نیازمندی کامیابی کی چوکھٹ کو بوسے دے رہا ہے۔

وہ والہانہ آگے بڑھتا ہے، روحِ اقبال کو، اقلیم ادب کے شہسوار کو بیتابانہ نیاز پیش کرتا ہے۔ کبھی پائنتی کو چھوتا ہے کبھی سرہانے پہنچتا ہے، اور روح پُر فتوح پر سورۂ فاتحہ اور سورۂ یٰسین کے پھول نچھاور کر کے نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کرتا ہے۔ آنکھیں پُرنم ہیں، آواز میں کپکپی ہے۔ میرے کان اس زائر کی آواز پُراثر سے آشنا ہوتے ہیں۔ ہاں میں سن رہا ہوں، وہ مجذوبانہ راز و نیاز میں مصروف ہے اور مرقدِ اقبال سے یوں مخاطب ہے:-

" اے کروڑوں نفوس کو حیاتِ ثانیہ کا پیغام دینے والے!

تیرا یہ مدّاح آرزوئے دیرینہ کی تکمیل اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کی سعادت حاصل کر کے دلی مسرت محسوس کر رہا ہے اُسے تیری آستاں بوسی پر ناز ہے۔

اے حیاتِ جاوید پانے والے!

یہاں سے دو ہزار میل دور شہر کلکتہ کے بتکدوں کی سرزمین پر پرچم اسلام کو، گزشتہ ایک ہزار سال سے مسلسل بلند رکھنے والے ہم نہ صرف دس لاکھ اسلامیان برما بلکہ پونے دو کروڑ باشندگان برما کی جانب سے تجھے سلام محبت و عقیدت پیش کرتے ہیں۔

اے مشرق کو بیدار کرنے والے!

تو صرف اہل پاکستان کا ہی نہیں، برصغیر ہند و پاکستان کے علاوہ ساری عالم انسانیت کا پیامبر ہے، تو شاعر انسانیت ہے تیرا کلام ہمہ گیر ہے اور ہر کس و ناکس کے لئے ہے، تیرا خودی کا وہ پیغام

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف | کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
یہی ہے سِرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں | ہوائے دشت و شعیبؑ و شبانیٔ شب و روز

اور انسانِ کامل کا وہ تخیل ہے　　نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کل نوعِ انسانی کے لئے خضرِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، بلاشک تو نے انسانِ کامل کو مردِ مومن کی صورت میں دیکھا اُسے خودی کا پیغام دیا اور دنیا کے لئے اُسے تو نے کامل انسان ٹھہرایا حصولِ مقصد کیلئے۔ ہاں، ہمیں انسانِ کامل کا نمونہ بنانے کے لئے اے اقبال! تو نے فلسفۂ قدیم وجدید کے میدان میں اپنے توسنِ فکر کو مہمیز کیا، اور پھر ندرتِ تخیل، شوکتِ الفاظ، محاوروں کی فراوانی، بندش کی چستی، اندازِ بیان اور الہامی زبان کی پردو کشش کے ساتھ ساتھ اپنے کلام میں تو نے، فصاحت وبلاغت کے موتی بکھیر دیئے، حساس طبائع بیدار ہو گئے، جسدِ مردہ میں، روح پڑ گئی، اب وہ متحرک ہے، آج پھر دنیا اسلام کو ایک زندہ اور قابلِ احترام طاقت تسلیم کر رہی ہے،

اے مفکرِ اعظم! تو نے ایک خواب دیکھا تھا، اور تجھے یقین تھا کہ اُسکی تعبیر سچ ہو کر رہیگی، بیشک آج تیری روح مسرور ہو گی، کیونکہ اے نقیب! تیری آوازِ جرس کو سُن کر کارواں چل پڑا، سچی تڑپ اور قوم کا درد رکھنے والے مسافر، تیری بتائی ہوئی منزل تک پہنچ گئے، لیکن نہیں، ابھی وہ اپنی صحیح منزل سے بہت دور ہیں اور ابھی گرمِ سفر ہیں، آج بھی تیرے جانثاروں کی آنکھوں میں جوش وولولے، یقینِ محکم ہے۔ ضبط ونظم کے ساتھ ساتھ عملِ پیہم بھی ہے۔ اور فاتحِ عالم محبت بھی۔ ایک میرِ اور پورا قافلہ تابع فرمان ہے۔

چار سال کی مختصر سی مدتِ حیات میں تیرے دلدادگان نے مصائب وآلام اور ناامیدی سے گھری ہوئی دنیا کو امن وسلامتی، اخوت وطمانیت اور جہدِ مسلسل کا پیغام دیکر زندگی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ زیردستوں کے ساتھ ہیں اور زبردستوں سے ٹکر لینے کو آمادہ! رنگ ونسل اور جغرافیائی حدود کو ختم کر کے وہ بین الاقوامیت، انسانیت، مساوات، اخوت ومحبت اور روحانیت کا حیات بخش اور روح پرور پیغام، اس بھٹکتی ہوئی دنیا کو نظم وضبط کے ساتھ پہنچا رہے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انتہائی مادی ترقی کی حامل یہ دنیا صرف روحانیت اور انسانیت کی متلاشی ہے۔

میرا ایمان ہے کہ آج تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے انسانوں کے مکمل نمونے اصلی سانچوں میں پھر ڈھل رہے ہیں، دنیا کامل انسانیت کی جانب جھک چکی ہے مجھے اعتماد ہے کہ دنیا کی برائیاں مٹ کر رہیں گی، باطل کی بدلی چھوٹ کر رہیگی مردانِ باخدا کی تعداد میں پھر حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ اور دنیا کے مسلمان پھر قیادت کا فرض انجام دیں گے۔

اے جنت کے ساکن اقبال! تیری آواز مشرق میں برما، ملایا، انڈونیشیا اور آسٹریلیا تک پہنچ چکی ہے اور مغرب میں یورپ اور افریقہ کے سواحل سے دور، بحرِ اوقیانوس کے اُس پار، امریکہ کی نئی دنیا تک اسکی رسائی ہو چکی ہے، بیشک انسانیت پر تیرے عظیم احسانات ہیں وہ دن دور نہیں، جب دنیا کے گوشے گوشے سے عالمِ انسانیت تیری روح کو خراجِ عقیدت پیش کرے گی اور دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے ادبی ذخیروں میں تیرے ادبی شاہکار ایک بیش قیمت اضافہ ثابت ہونگے۔

روحِ اقبال! سرزمینِ گوتم کے پونے دو کروڑ نفوس تک تیری حقیقی آواز کو پہنچانے کی خاطر یہ بندۂ حقیر اپنی زندگی وقف کرنے کا عہد کر رہا ہے، خدا مجھے توفیقِ عمل دے یا رب! اے ترکشِ مارا خدنگِ آخریں !!! الوداع ۔۔

یہ خطاب سُن کر میں بھی بے چین ہو گیا، میرے منہ سے بھی بیساختہ آمین کی صدا بلند ہوئی، پھر دیکھا کہ خلوص وعقیدت کے یہ پیکر دفعتاً اٹھے ان میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ مرقدِ اقبال سے دور ہوتے چلے گئے میری آنکھیں شاہی قلعے کے بڑے پھاٹک تک ان دونوں کا تعاقب کرتی رہیں۔

ممتاز حسین

ادب اور پروپیگنڈا

دنیا کا سارا ادب پروپیگنڈا ہے۔ لیکن پروپیگنڈا ادب نہیں ہے یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ لیکن جب تک اس موضوع کو خاص طور سے نہ لیا جائے اس کی وضاحت نہیں ہو پاتی ہے کہ ادب کن معنوں میں پروپیگنڈا ہے اور کن معنوں میں پروپیگنڈے سے آزاد ہے اس میں شبہ نہیں کہ پروپیگنڈے کا لفظ معیوب سا ہو گیا ہے کیونکہ کچھ لوگوں نے پروپیگنڈے کے معنی کو کسی غلط بات کے بار بار دہرانے کے مترادف کر دیا ہے۔ لیکن اگر ہم پروپیگنڈے کو صرف تبلیغ و اشاعت کے معنی میں لیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ ادب بھی ایک قسم کا پروپیگنڈہ ہے کیونکہ تبلیغ و اشاعت کا کام اس سے لیا جاتا رہا ہے اور لیا جا رہا ہے، خواہ وہ تبلیغ بالقصد ہو یا غیر شعوری آپ دنیا کے کسی بھی دور کے ادب کو اٹھا لیجئے۔ اس میں کسی نہ کسی نظریۂ حیات کی۔ کسی قدر کی تبلیغ کی گئی ہے، چنانچہ جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ دنیا کا سارا ادب پروپیگنڈا ہے تو اس کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ادب کے ذریعے خیالات اور اقدار کی نشر و اشاعت کی گئی ہے لیکن جس طرح کہ آپ اس حقیقت کی تبلیغ کو پروپیگنڈا نہیں کہتے ہیں کہ زمین گول ہے اسی طرح آپ اس ادب کو پروپیگنڈا نہیں کہہ سکتے ہیں جو ان حقائق کی تبلیغ کرتا ہے جس کے بارے میں سائنس کے اعتبار سے دو رائے کا پایا جانا محال ہو۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ پروپیگنڈے کا تعلق اصل میں مواد کی ہیئت سے ہے نہ کہ تبلیغ و ترسیل کی خدمت سے، اور یہ بات آئے دن دیکھنے میں بھی آتی ہے کہ ہم بعض چیزوں کو پروپیگنڈا کہتے ہیں۔ جن کے بارے میں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ علانیہ انھیں بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے لیکن پروپیگنڈے کے جانچنے کا یہ تنہا معیار ہم ادب کے میدان میں لاگو نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جب ہم آرٹ اور ادب کو اس کے میڈیم کے ساتھ مخصوص کر چکے ہیں تو ہمیں اس کے جانچنے کے لئے ایک نیا معیار وضع کرنا ہوگا۔ جس کا تعلق صرف مواد ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعۂ اظہار اور اسلوب سے بھی ہو۔ لیکن چونکہ ذریعۂ اظہار کو متعلقہ مواد ہی کی رو سے جانچا جا سکتا ہے اس لئے اس موقع پر ہم پہلے مواد ہی کو لیں گے۔

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ ادب کا کام حقیقت کے بارے میں انسانی علم کی ترسیل کا ہے پھر تو کیونکر ممکن ہے کہ اس علم کی ترسیل و تبلیغ کو پروپیگنڈے کے ایسے گھٹیا لفظ سے یاد کیا جائے تاوقتیکہ وہ علم دریافت حقیقت کے تمام معیاروں سے گرا ہوا ہو۔ مثال کے طور پر سائنس کے میدان میں جہاں تمام نظریوں کی بنیاد انسانی تجربے پر ہوتی ہے آپ کسی نظریے کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ صرف پروپیگنڈا ہے حالانکہ تصادم رائے کے امکانات سائنس کے میدان میں ادب و فلسفے کے میدان سے کچھ کم نہیں ہوتے لیکن فرض کیجئے کہ اگر کوئی سائنس داں اسی بات پر تل جائے۔ کہ وہ اپنے نظریے کی صحت انسانی تجربوں کی بنیاد پر کرنا نہیں چاہتا تو آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ محض یہ اس کا ذاتی نظریہ ہے اور اس وقت آپ کو یہ کہنے کا مجاز ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کی تبلیغ نہیں بلکہ کسی

ذاتی یا طبقاتی مفاد کے ماتحت ایک مخصوص نظریئے کا پروپیگنڈا کر رہا ہے لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس معیار کو صرف طبیعیاتی علوم تک محدود رکھتے ہیں، اور سماجی علوم کو سائنس کے زمرے میں شمار نہیں کرتے۔ ان کا یہ خیال باوجود ان کی نیک نیتی کے غلط ہے کیونکہ اگر فطرت کے مظاہر میں جمادات، نباتات اور حیوانات کی زندگی شامل کی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس دائرے میں انسان کی زندگی کو کیوں نہ شامل کیا جائے، اور سماجی علوم کو بھی اس سطح تک کیوں نہ بلند کیا جائے جس سطح پر طبیعیاتی علوم آئے ہیں۔ ایسا اب تک کیوں نہیں ہوا یعنی سماجی علوم کو سائنس کی سطح تک سو سال سے بیشتر کیوں نہیں لایا گیا اس کے بہت سے اسباب تھے جن میں سے میں صرف دو کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ سماجی مظہر کو سمجھنے کے لیے جن ابتدائی اطلاعات (انفارمیشن) کی ضرورت تھی وہ سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے فراہم نہیں کئے جا سکتے تھے، دوسرے یہ کہ کوئی بھی علم سائنس کا درجہ اس وقت تک اختیار نہیں کرتا ہے جب تک کہ اس علم کے ذریعے انسان اپنے عمل سے خاطر خواہ نتائج مرتب نہیں کرتا ہے۔ نظریہ کی صحت جانچنے کا صرف یہی ایک معیار ہے کہ ہم اپنے انسانی عمل کے ذریعہ جانچیں کہ کارل مارکس نے سماجی مظہر کے بارے میں جو قوانین دریافت کئے اور جنہیں اشتراکی نظریے میں منظم کیا وہ اس وقت تک بیشتر حلقوں میں خیالی سمجھے جاتے تھے جب تک کہ اشتراکی انقلاب سوویٹ روس میں انہیں اصول کے زیر اثر رونما نہیں ہوا۔ پھر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف اس وقت بلکہ آج بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اسے نہ ماننے اور غلط ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر سماجی علوم میں یہ تصادم رائے کیسی ہے۔ کیا اس کی نوعیت ویسی ہے جیسی کہ سائنس کے میدان میں ملتی ہے، ایک سائنس داں کہتا ہے کہ روشنی جگہ گھیرتی ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں یا اس سے مختلف ہے، میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ طبیعیاتی میدان میں تجربے کی نوعیت سماجی میدان کے تجربے سے مختلف ہوتی ہے اس کا اختلاف تجربے کی نوعیت میں نہیں بلکہ تجربے کرنے والوں کے طبقاتی مفاد میں پوشیدہ ہے۔ جب ایک سائنس داں طبیعیات کے میدان میں تجربہ کرتا ہے تو وہ بے شمار انسانوں کی قوت ارادی کو نہ تو استعمال کرتا ہے اور نہ ان کی مخالفت کرتا ہے وہ براہ راست کسی شخص کی ملکیت اور اثاثے کو ہاتھ نہیں لگاتا، نہ کسی طبقے کو، ذرائع پیداوار کی ملکیت سے بیدخل نہیں کرتا ہے اور نہ محکوم ممالک کو آزادی کے لئے اکساتا ہے۔ اس کے برعکس وہ صرف اپنے معمل اور فارمولے کے ساتھ الجھا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنے معمل کو ایک بار نہیں دس بار بھی الٹے پلٹے تو کسی سرمایہ دار کے بنک سے نہ تو روپیہ کم ہوگا اور نہ کسی جاگیردار کی زمین چھنے گی، چنانچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ طبیعیاتی تجربے میں کسی بھی مخلص سائنسداں کی طبقاتی پوزیشن اس کے تجربے میں مخل نہیں ہوتی ہے، لیکن سماجی علوم کے میدان میں یہ صورت قائم نہیں رہتی ہے اس میدان میں جہاں کہیں آپ نے یہ بتایا کہ سماج یوں بدل رہا ہے اور اس کے بدلنے کا یہ قانون ہے توپ و تفنگ اپنی جگہیں سنبھالنے لگتی ہیں، عدالتیں انصاف کا دروازہ بند کر دیتی ہیں، گو انسان کے لئے خود اس کے اپنے سماج کا علم تمام علوم سے زیادہ خطرناک ہے۔ اگر امریکہ برطانوی اقتدار سے آزادی حاصل کرتا ہے تو وہ آزادی کا دن ہے۔ لیکن اگر جاپان اس کی کوشش کرے تو وہ آزادی نہیں بلکہ غلامی کی جدوجہد بن جاتی ہے۔ اگر فرانس کے تجار اور صنعتی کارخانوں کے مالک رؤسا اور جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں تو وہ انقلاب ساری دنیا کا

انقلاب بن جاتا ہے لیکن اگر روس کے عوام وہاں کے سرمایہ دار اور زارشاہی کے خلاف بغاوت کرتے ہیں تو وہ بدعت بن جاتی ہے اگر امریکہ مزدوروں سے انقلاب کرنے کا حق چھین لے تو وہ آزادی ہے۔ لیکن اگر سوویٹ روس سرمایہ داروں سے انقلاب کو شکست دینے کا حق چھین لے تو وہ غلامی ہے۔ رہ گیا منطق کا استعمال سو وہ کسی کی طرف نہیں ہے۔ بہرحال اس سے پتہ چلا کہ کسی بھی طبقاتی سماج میں سماجی علوم کے میدان میں تصادم رائے اور تجربے کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی ہے جس کا مظاہرہ سائنس کے میدان میں ہوتا ہے۔ سماجی علوم کے میدان میں عالم کی طبقاتی پوزیشن اس کے نظریئے اور تجربے کو متاثر کرتی ہے کیونکہ اس کا عمل بے جان مادہ، پودہ، جانور نہیں بلکہ ان انسانوں کی زندگی ہوتا ہے جو اپنے سماجی اور پیداواری رشتوں میں حاکم و محکوم لوٹنے اور لٹنے والے طبقات میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس کے یہ معنیٰ ہوئے کہ کسی بھی طبقاتی سماج میں سماجی مظہر کا علم طبقاتی مفاد کے تصادم کے باعث اس حقانیت کا درجہ اختیار نہیں کر سکتا ہے جو سائنس کو حاصل ہے تاوقتیکہ غیر طبقاتی نظام قائم نہ ہو جائے۔ لیکن وہ حضرات جو سماج کو فطرت کا ایک جزو سمجھتے ہیں اور جن کا کوئی استحصالی تضاد نہیں ہے وہ طبیعاتی اور سماجی دونوں علوم کو ایک ہی معیار پر پرکھتے ہیں لیکن چونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب کا گہرا تعلق براہ راست سماجی علوم سے ہے نہ کہ طبیعاتی علوم سے اسلئے اس چیز کو سمجھنے کے لئے ہمیں سائنس (طبیعاتی علوم) اور ادب کے رشتے کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

سائنس ہو یا ادب دونوں ہی کا تعلق شعور کی دنیا سے ہے، پھر ایسا کیوں ہے کہ باوجود شدید اختلاف کے سائنس کو مذہبی آدمی بھی پروپیگنڈا نہیں کہتا لیکن ادب کو سائنسداں پروپیگنڈا کہہ لیتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ادب کا تعلق براہ راست انسانوں کی زندگی سے ہے ان کے نفسیاتی اور سماجی مظہر سے جن کا مطالعہ کسی بھی طبقاتی سماج میں غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتا ہے یہاں اعتراضاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ چند ادیب ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے طبقاتی سماج میں رہتے ہوئے حقیقت کو پیش کرنے میں غیر جانبداری سے کام لیا ہے مثلاً بالزاک اور ٹالسٹائی یہ صحیح ہے کہ بحیثیت مجموعی وہ سماج کی بدلتی ہوئی شکل کو پیش کرتے ہیں اور اس کی خارجیت کو اپنے سیاسی یا مذہبی عقیدہ یعنی طبقاتی خیالات سے مجروح نہیں کرتے ہیں۔

لیکن یہ دعویٰ بغیر توضیح کے صحیح نہیں ہے۔ وہ گرتے ہوئے طبقے کے زوال اور ابھرتے ہوئے طبقے کی کشمکش دونوں ہی کو پیش کرتے ہیں، لیکن اس تصادم میں جو نئی صورت بنتی اور ابھرتی ہے، خارجی طور سے اسے پیش کرنے کے بجائے اپنے مذہبی یا سیاسی عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں، ٹالسٹائی مسیحیت کی تعلیم دیتے ہیں تو بالزاک آئینی شاہیت کا حل پیش کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے کلام کو جانچتے وقت ایک ایسے ناقد کا کیا نظریہ ہونا چاہئے جو سماجی مظہر کے علم کو قطعاً خارجی اور سائنسی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں صاف صاف لفظوں میں اس حصے کو غلط شعور کی تبلیغ سمجھنا چاہئے جہاں مسیحیت یا آئینی شاہیت کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ وہ شعور ان ممالک کی خارجی حقیقت اور سماجی قدر سے مطابقت نہیں رکھتا ہے جو کہ تاریخ نے ثابت کر دیا اور اس حصے کو انسانی تاریخ کا جزو سمجھنا چاہئے، جہاں زندگی کی مصوری خارجی انداز میں کی گئی ہے۔ لیکن اس سائنسی نقطۂ نظر کو سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ناقدین

اختیار نہیں کرتے ہیں اس کی بڑی موٹی سی مثال یہ ہے کہ جب تک گورکی سماج مبتدئ اور خانہ بدوشوں کی زندگی کو پیش کرتا رہا اس کا فن ان کے لئے پروپگنڈا نہیں تھا لیکن جب وہی گورکی مزدور طبقے کی زندگی کو اس کے تاریخی رول میں پیش کرنے لگا تو اس کا فن پروپگنڈا بن گیا، اس کے یہ معنی ہوئے کہ کسی بھی ادب کو پروپگنڈا طبقاتی عصبیت کی بنا پر بھی کہا جاتا ہے۔ ذکر مواد کے سائنسی تجربے کی بنا پر۔ لیکن لفظ پروپگنڈے کے غلط استعمال کا دائرہ صرف طبقاتی عصبیت یا حقیقت کے ساتھ عدم مطابقت رکھنے ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں وہ ادب بھی شامل ہے جہاں حقیقت کو توڑ مروڑ کر، یا سماجی رشتوں کے تناسب کو نظر انداز کر کے پیش کیا جاتا ہے اس کے زمرے میں وہ ادب بھی آتا ہے جہاں سماج کی مجموعی صورت نہیں بلکہ صرف یک طرفہ صورت پیش کی جاتی ہے۔

جانب داری کا ولولہ خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی جب وہ جنوں کی منزل اختیار کر لیتا ہے تو وہ حقیقت کو اس کے تمام پہلوؤں میں دیکھنے سے تغافل کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے چنانچہ اس قسم کی بے راہ روی ترقی پسند ادیبوں کے یہاں بھی ملتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادب واقع الامر پر زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ کیا ہونا چاہئے یہ فنکار کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ چنانچہ ہی ضرورت کے ماتحت فنکار کردار کو مثالی بنا کر پیش کرتا ہے جو اس کی نظر میں زندگی کی نئی ابھرتی ہوئی صورت کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ حقیقت کے صحیح رشتوں کو پیش نہ کریں، مرتے ہوئے طبقے کے دیوالیہ پن کے ساتھ ساتھ ابھرتے ہوئے طبقے کی توانائی اور خامی دونوں کی طرف اشارہ نہ کریں، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لازمی ہے کہ تشکک اور قنوطیت کا شکار نہ ہوں کیونکہ قنوطی نقطۂ نظر حقیقت کو اس کے مستقبل اور پھیلاؤ میں دیکھنے سے روکتا ہے۔ زندگی کا صرف ایک نقطۂ نگاہ ہے وہ نقطۂ نگاہ متحرک بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی ہے۔ تنقید صرف اسی نقطۂ نظر سے ہونی چاہئے۔

ابتک ہم پروپگنڈے کے اس مفہوم سے متعلق باتیں کرتے رہے تھے جس کا تعلق مواد سے تھا اور وہ مواد ادب صحافت، تاریخی، تمدنی اور علمی کتابوں میں مشترک ہو سکتا ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب اور پروپگنڈے کا امتیاز صرف مواد ہی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کی صورت یا فارم کی بنیاد پر بھی کرنا چاہئے۔ ایک دستاویزی ناول اپنے تاریخی مواد میں بے داغ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ناول کے فنی معیار پر پورا اترے۔ یہ بات مسلمہ ہے۔ . کہ ادب کے میدان میں خیالات کا اظہار احساسات کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے پھر بھی یہ تصور اس قدر تعمیم یافتہ ہے کہ اگر آرٹ کے مختلف اصناف اور ان کی مختلف تکنیک یا گُر کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ تصور زیادہ دیر تک رہنمائی نہیں کر پاتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس طرف آئیں ہمیں یہ طے کر لینا چاہئے کہ آرٹ کا کام انکشاف حقیقت کے ذریعے انسانی شعور کو بیدار کرنے اور عمل کی راہیں کھولنے کا ہے یا ترغیب و تحریص کے ذریعے وقتی طور پر کسی بات کو منوا لینے کا۔ اگر نتیجے کے طور پر دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا ہے لیکن چونکہ دونوں کی پہنچ ایک ہی مسئلے کی طرف مختلف ہے اس لئے اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر نتیجے پر اثر انداز ہو سکیں، اب اس چیز کو مثال سے سمجھئے۔

جب آپ کسی ناول کو پڑھنے کا تہیہ کرتے ہیں تو آپ اس کی توقع نہیں کرتے ہیں کہ یہاں حقیقت کو اس طرح بے نقاب کیا جائے گا جس طرح کہ کسی مضمون میں بلکہ اس کے برعکس یہ توقع کرتے ہیں کہ یہاں ادراک

حقیقت میں کچھ احساسات کی بالیدگی کو بھی دعوت ملے گی، جو اطلاعات کی منزل سے بلند ہوگی۔ اور جس وقت کسی ناول میں آپ کو یہ چیزیں نہیں ملتی ہیں تو آپ ان حقائق سے دل برداشتہ نہیں ہوتے ہیں جن کا تذکرہ وہاں موجود ہوتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح ہوں، بلکہ فن کار کے اس تجزیے سے جو آپ کی مذکورہ توقعات کو پورا نہیں کرتا ہے۔ آپ دل برداشتہ اس وجہ سے نہیں ہوتے ہیں کہ اس میں حقیقت کو غلط طور سے پیش کیا گیا ہے بلکہ اس بات سے کہ آپ کے اس جمالیاتی احساس کو تسکین نہیں ہو پاتی جس کی تربیت آپ نے آرٹ کے مطالعے سے کی تھی۔ لیکن اس قسم کی توقع آپ کسی صحافی کی تحریر یا کسی مقرر کی تقریر کے ساتھ وابستہ نہیں کرتے ہیں حالانکہ مقرر اور صحافی دونوں ہی آرٹ کے میڈیم کو بھی استعمال کرتے ہیں لیکن التزام خصوصی کے ساتھ نہیں بلکہ اتفاقیہ طور سے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اگر طریق کار میں غلطی سرزد ہوتی ہے تو وہ اپنے نتیجہ پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ جب ادب میں اس طریق کار کو برتا نہیں جاتا ہے تو آپ کی جمالیاتی تشفی اور تسلی نہیں ہو پاتی ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آرٹ کا ذریعہ اظہار بھی زندگی کی ایک بہت ہی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اس طرح سوچیں کہ اگر ادب کی تخلیق نہ ہو تو بھی زندگی کی رفتار رک نہیں سکتی ہے۔ کیونکہ انسانی شعور کے اظہار کے اور بھی ذرائع ہیں۔ لیکن اس موقع پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر آرٹ نہ ہو تو انسان اپنی نفسیات کو پر مایہ اور عمیق بنانے میں سخت ناکام رہیگا اور یہ کمی اتنی بڑی ہے کہ بالآخر یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ سائنس اور آرٹ دونوں ہی مل کر زندگی کو مکمل کرتے ہیں گو یہ صحیح ہے کہ جس طرح روحانی زندگی کی بنیاد مادی زندگی پر ہے اسی طرح تخلیقات میں مادی تخلیقات کو اولیت روحانی تخلیق پر حاصل ہے۔ لیکن اولیت حاصل ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ آپ روحانی تخلیقات کو نظر انداز کر دیں کیونکہ مادی زندگی کو آگے بڑھانے میں مادی تخلیقات کے ساتھ ساتھ روحانی تخلیقات کا بھی ہاتھ ہے۔ اس چیز کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم شعور کے اظہار میں اس افادیت کو فراموش کر دیتے ہیں جس کا تعلق زبان کے ایک خاص استعمال یا مجرد کو محسوس بنا کر پیش کرنے میں ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادب میں اگر ایک طرف ایسی تصنیفات ہیں جہاں دونوں قدروں کا خیال رکھا گیا ہے تو دوسری طرف ایسی تصنیفات بھی ہیں جن میں جمالیاتی قدریں نظر انداز ہو گئی ہیں۔ کہیں ایک نظم میں صرف تقریر ہے تو کہیں کسی افسانے میں مختلف تقریروں کا نچوڑ۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اپنی کمزوری کے شعور رکھنے کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ہم اپنی تخلیقی کوششوں میں حد لگا کریں، یا نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی نہ کریں، اور نہ ادب کا معیار متعین کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم فوراً اعلیٰ قسم کا ادب تخلیق کرنے لگیں گے، اعلیٰ قسم کا ادب اسی طرح کی ابتدائی تخلیقی کوششوں سے ہی پیدا ہوگا بالآخر انسان اپنی غلطیوں ہی سے سیکھتا ہے، اس سے زیادہ اہم بات یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے، اور یہ کام قومی آزادی کی جدوجہد، تعلیمی، تمدنی، معیار کی بلندی کے ساتھ وابستہ ہے لیکن جب تک وہ منزل نہیں آتی ہر اس جدوجہد میں حصہ لینے والی ہر تحریر کو شہ پارے کی جگہ نہیں مل سکتی ہے۔ گو ان تحریروں کی سماجی خدمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بذات خود ایک ادبی مقصد ہے۔ لیکن اتنا موثر نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے۔

موثر ادبی خدمت تو اس وقت ہوگی جبکہ آپ انسانی زندگی کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیں۔ اس سلسلے میں

ہمارے کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ جمالیاتی قدروں کا تعلق صرف فنی لوازمات سے ہے۔ ذکر ادبی مواد سے، یہ نقطۂ نظر یک طرفہ اور غلط ہے، کیونکہ ادب میں صورت و معنی دو خارج سے لائی ہوئی علیحدہ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ظاہر اور باطن، اظہار اور حقیقت کا رشتہ رکھتی ہیں۔ انھیں ہم ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ادب میں فنی لوازمات کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ خیال کو کیونکر محسوس کراتے ہیں۔ ناول میں ایک کردار نہ صرف ایک ٹائپ یعنی بہت سے کرداروں کی مشترکہ ذہنی خصوصیات کا مجموعہ ایک فرد بھی ہوتا ہے اور اس کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے تاکہ وہ تجربات کو شخصی سطح پر محسوس کر کے پیش کرے۔ جب ناول میں اس چیز کا خیال ہی نہیں رکھا جاتا ہے تو مشترکہ ذہنی خصوصیات اور مسائل حیات کی ترجمانی تو ہو پاتی ہے لیکن وہ ترجمانی آرٹ کے حیطے میں نہیں ہوتی ہے۔ یعنی وہ ترجمانی صرف قوت ادراک کے توسط سے ہوتی ہے نہ کہ احساسات کے ذریعہ بھی۔ ایسی صورت میں وہ ناول موثر نہیں ہوتا ہے گو اس میں ناول کا فارم اور مقصد موجود رہتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے ناول میں اس زمانے کے متوسط طبقے کی لڑکیوں اور لڑکوں کے مسائل کا ذہنی ادراک موجود ہے، لیکن ان کا اظہار موثر ناول کے فارم میں نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے کردار ٹائپ ہیں لیکن فرد نہیں ہیں۔ اسی طرح منشی پریم چند کے ناول "میدان عمل" میں کردار کی انفرادیت دب سی گئی ہے۔ لیکن "گئو دان" میں وہی فن کار ہوری کے کردار کو ٹائپ اور انفرادیت دونوں ہی پہلوؤں سے پیش کرتا ہے۔ آپ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ہوری کوئی فرضی نام نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے اور اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی غربت اور افلاس کو دور کرنے کی جدوجہد میں پورے سماج کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ بات "میدان عمل" میں زمیندار صاحب یا وکیل صاحب کے کردار میں نہیں ہے۔ اس ناول کا خشک مباحثاتی مکالمہ اسی کمزوری کا سبب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فنکار اپنی بات محسوس نہیں کرا پاتا ہے۔ گو منطق کے ذریعے عقل تک ضرور پہونچا تا ہے۔ ناول نگار کا کام زندگی کی صداقت کو صرف ذہنی ادراک کے ذریعے منوانا نہیں بلکہ محسوس کروانا بھی ہے اور یہ کام سماجی رشتوں کی مصوری کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ آرٹ کے کسی بھی صنف میں خیال کی ذہنی دلالت ہی کافی نہیں ہے بلکہ خیال کو محسوس کروانا بھی ضروری ہے۔ اگر آپ اس معیار پر دور جدید ادب کو جانچیں تو جہاں خوبیاں نظر آئیں گی کمزوریاں بھی دکھائی پڑیں گی۔

. . . .

جہاں تک شعراء کا تعلق ہے جن کا مواد صرف جذباتی رد عمل پر مبنی ہے۔ ان کی شاعری ادراک حقیقت سے کٹ کر منتشر خیالات کے اظہار کا جواز بن گئی ہے، اور جہاں تک ترقی پسند شعراء کا تعلق ہے ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے یہاں ادراک حقیقت کو محسوس طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن کے یہاں سماجی یا سیاسی مسائل کا ذہنی ادراک تو موجود ہے لیکن اس کا اظہار احساسات سے عاری ہے۔ ایک دوسرا رجحان جو اس کمزوری کے رد عمل میں ابھرا ہے وہ خطابت کا ہے، خطابت بذات خود کوئی بری چیز نہیں بشرطیکہ اس کی اساس سامعین کی جذباتی عصبیت پر نہ ہو، بلکہ ادراک حقیقت پر ہے، اس کا جوش گرمی محفل کا تماشہ نہ ہو بلکہ خیال کو جذبے میں بدل دینے کا ہو۔ لیکن چونکہ یہ کام محنت کا ہے اس لئے کبھی کبھی وہ رجحان صرف لفظوں کی گونج میں رونما ہوتا ہے یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی خطابت سے بھی سماجی خدمت ہوتی ہے، لیکن وہ خدمت بلند پایہ ادب کی خدمت سے

مختلف ہے۔ لیکن خطابت کی مخالفت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعری پُرجذبہ نہ ہو۔ اس چیز کا تذکرہ میں پہلے ہی کرچکا ہوں کہ ادب کا تعلق سماجی مظہر کو بدلنے سے ہے اور چونکہ یہ کام طبقاتی سماج میں تمام انسانوں کے متحدہ عمل سے نہیں بلکہ تصادم عمل سے ہوتا ہے اس لئے خیالات جب جذبے (PASSION) میں تبدیل ہوتے ہیں تو وہ ادراک حقیقت کی جانبداری کے ساتھ شدید قسم کی طبقاتی جانبداری میں بھی شامل ہوجاتے ہیں اور اس طبقاتی جانبداری کو جو ذہنی اور جذباتی دونوں ہی ہوتی ہے خطابت کے ساتھ ہم معنی نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ خطابت کا دوسرا نام سطحیت ہے جو ذہنی اور جذباتی دونوں ہی قسم کی ہوسکتی ہے۔ بہرحال ڈھب کے ہاتھے وہ ناقدین جو کبھی کبھی ترقی پسند ادب کو بھی تنقید کے لئے قابل اعتنا سمجھ لیتے ہیں ان نکات سے بےخبر ہونے کی وجہ سے ان کی فنی کمزوریوں کو نئی شاعری کے سیاسی مشن کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادب کسی ازم ہی کی تبلیغ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد قومی تاریخ کو اس کے بڑھتے ہوئے روپ میں پیش کرنے اور حقیقت کو دریافت کرنے کا ہے لیکن اگر کسی منزل حیات میں قومی زندگی کا اظہار سیاست ہی میں رونما ہو رہا ہو تو کیا اس سے آنکھیں بند کرلینا ادب اور زندگی کی خدمت ہوگی۔ چونکہ ابھی تک ہمارے ملک کی معاشی اور سیاسی بنیادوں میں جاگیردارانہ نظام کے رشتے اور تصورات موجود ہیں اس لئے اس حقیقت سے متعلق ان کا ردعمل بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں نہیں بلکہ پرانے طرز فکر اور پرانی جذباتی تنظیم کے ماتحت ہوتا ہے۔ سیاست کی جو آج تصویر اور اس کا ہمہ گیر نفوذ ہے وہ قدیم جاگیردارانہ دور میں نہ تھا۔ اس وقت سیاست شاہیت کے اداروں تک محدود تھی، آبادی کا بیشتر حصہ خود کفیل دیہاتوں کے پنجرے میں بند تھا۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتیں، لیکن یہ سیلاب ان کی خود کفیل زندگی کو متاثر کئے بغیر سر سے گزر جایا کرتا، انگریزوں کے آنے کے بعد وہ صورت حال نہ رہی۔ دیہاتوں کی خودکفالت کو شدید صدمہ پہنچا۔ شہر کا ہنرمند طبقہ بے دست وپا ہونے کے سبب سے شہر سے دیہات کی طرف چلا، آئینی نظام حکومت، نئی تعلیم اور بیرونی سامان کی خرید وفروخت نے ان کے تمام سماجی رشتوں کو بدل دیا۔ اس طریق کار سے ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا جو سرکاری ملازمتوں پر زندہ رہتا لیکن قومی وقار کو بلند کرنے کا بجز اس کے کوئی اور راستہ نہ دیکھتا کہ وہ آئینی اصلاح کے لئے جدوجہد کرے۔ یہ اسی جدوجہد کا تسلسل تھا کہ جب ہندستان میں دیسی سرمایہ دار پیدا ہوئے اور ان کا مفاد انگریز سرمایہ داروں سے ٹکرانے لگا تو قومیت کا تصور پیدا ہوا جس کا اظہار خالصتاً سیاسی جدوجہد میں ہوا ہے اور چونکہ غلامی کی صعوبتیں ملک کا ہر ایک طبقہ محسوس کرتا تھا اس لئے وہ سیاسی جدوجہد تمام طبقوں کی مشترکہ جدوجہد میں تبدیل ہوگئی، سچ پوچھئے تو سیاست عامہ ہی ادھر گزشتہ ساٹھ ستر سال سے ہماری قومی زندگی کے اظہار کا محور تھی۔ سرسید اور حالی کی تصنیفات میں اگر سیاست نہیں ہے تو پھر کیا ہے، اکبر اور اقبال کے یہاں اگر سیاست نہیں ہے تو پھر کیا ہے کہیں وہ سیاست براہ راست جھلکتی ہے تو کہیں بالواسطہ، نئے سماجی رشتوں اور نئی فکری قدروں سے اپنے کو ہم آہنگ کرتے یا انھیں رد کرتے ہیں ان حالات کے ماتحت ہمارے ان بزرگوں کی تنقید نئے ادب سے متعلق یہ کیونکر صحیح ہے کہ اس میں سیاست کی بو آتی ہے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر ہماری ادبی تحریکات کی تاریخ سے عدم واقفیت کا پتہ دیتا ہے ظاہر ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں جس طرح سرسید اور اقبال کی سیاست میں فرق ہے اسی طرح علامہ اقبال اور ترقی پسند

شعراء کی سیاست میں بھی فرق ہو سکتا ہے، آخر زمانہ ہمیشہ ایک ہی انداز سے تو نہیں چلتا۔ مطالبہ یہ نہیں کیا جاتا ہے کہ ادب کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ سیاسی خیالات سے نہ ہو بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خیالات حقیقت کے مطابق ہوں اور اگر سر سید اور شبلی کا نقطۂ نگاہ مگر اسکا تھا تو کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی مختلف نقطۂ نگاہ کیوں نہ ٹکرائیں، اور اگر ان ناقدین کا یہ خیال ہے کہ ادب کا تعلق صرف داخلی زندگی، یا نفسیاتی تجربوں سے ہے نہ کہ خارجی حالات کے ذہنی تجزئیے اور تغیر اور تبدل کے اثرات سے تو یہ پوچھنا بیجا نہ ہوگا کہ انسان کی داخلی زندگی کن حالات سے متاثر ہوتی ہے؟ ممکن ہے کہ وہ یہ جواب دیں کہ اس میں خارجی ماحول اور واقعات کو قطعی دخل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ سمجھنے کی کوشش لاحاصل نہ ہوگی کہ آخر غالب کے اس شعر کا کیا مفہوم ہے ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پر بہت سے ستم ہوئے

اگر بشر کے لئے وفا کی قدر اپنے نفسیاتی اثرات میں غیر تغیر پذیر دائمی اور اٹل ہوتی تو یہ گلہ کاہے کو ہم پر زمانے اور بھی ستم کئے ہیں۔ کیا اس سے پتہ نہیں چلتا ہے کہ غالب کی نفسیاتی کیفیت کا متن سماجی حالات سے متاثر ہوتا ہے اور یہ تغیر پذیری کچھ اسی شعر تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے سارے کلام میں موجود ہے۔

اور اگر انسان پیالہ و ساغر نہیں بلکہ بہت ہی زیادہ حساس کھال کا جانور ہے جو اپنی نفسیات کو مادی تخلیقات کے طریق کار یعنی تہذیب و تمدن کے آغوش میں کھو رہا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی داخلی کیفیات خارجی حالات ہی سے متعین اور متاثر ہوتی ہیں، پھر بھی یورپ میں کچھ ایسے ادیب اور نقاد ہیں جو یہ بتلاتے ہیں کہ ادب کا تعلق انسان کی (پبلک) سماجی زندگی سے نہیں بلکہ نجی زندگی سے ہے، اس دعوے کو جانچنے کے لئے ہمیں تاریخ کا سہارا لینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نظریہ ایک مخصوص تاریخی دور اور سماجی حالات کے ماتحت پیش کیا گیا تھا، یہ نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کے اس دور انحطاط کا ہے جبکہ سرمایہ دار طبقہ اپنے پبلک اعلانات میں جمہوریت کی قدروں کا ادعا کرتا تھا لیکن سماجی رشتوں میں انھیں جھٹلا دیتا تھا چونکہ ادب کا تعلق سماجی رشتوں ہی کو بے نقاب کرنے کا ہے اس لئے اگر ادب اپنے اس منصب پر قائم رہتا تو زندگی کے خارجی تجزئیے میں اس کے ظلم و استحصال کا جھلکنا لازمی ہو جاتا، اور یہ ادبی حقیقت اس کیلئے نہایت ہی تلخ ہوتی اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ادب کو زندگی کے خارجی تجزئیے سے بالکل ہی آزاد کر کے صرف نجی زندگی کی عکاسی تک محدود کیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں جو دقت پیدا ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ نجی زندگی میں انسان حیوانی قدروں سے ہمکنار ہو چکا تھا کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام تمام انسانی رشتوں کو سکوں کے رشتے میں بدل چکا تھا۔ چنانچہ اگر وہ اس نظریے کے ماتحت انسان کی سفاکی اور بربریت کو بغیر کسی فلسفے کے پیش کرتا تو ہر شخص یہی کہتا کہ اس نظام کو بدلنا چاہئے تاکہ بربریت کا خاتمہ ہو۔ کاش یہی ہوتا۔ لیکن ان ادیبوں کا خلوص اس موقع پر کارفرما نہ رہا، اس کے برعکس انھوں نے "گنہگار آدم" اور "ہٹلر کی ابدیت" کا فلسفہ پیش کیا۔ تاکہ قارئین انسان کی خبیث نفسیات کو سرمایہ دارانہ نظام کا خصوصی مظہر نہ سمجھیں بلکہ ایک ابدی حقیقت تصور کریں، یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آگے بڑھتا ہے جس طرح نجی زندگی کو پبلک زندگی سے علیحدہ کر کے نجی زندگی کی گندگی کا فلسفہ بنایا گیا اسی طرح لاشعور کو شعور سے علیحدہ کر کے لاشعور کا فلسفہ تیار کیا گیا جس میں انتشار محض اور جنسیاتی محرکات کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ آج یورپ میں علم النفس کا سارا زور کلام اس بات کے ثابت کرنے میں صرف ہو رہا ہے

کر سانس ان اپنی جبلیت اور نفسانی خواہشات کا شکار ہے۔ عقل اور ترقی کی قدریں بیکار ہیں کیونکہ اس کی نفسیات خارجی حالات کی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی جبلت سے متعین ہوتی ہے۔ ابھی حال ہی میں فرانس کے آٹھ نو ماہرین نفسیات نے ایک بیان کے ذریعے یہ بات روشن کی ہے کہ علم النفس اپنے علمی اور سائنسی دائرے سے گر کر سرمایہ دار طبقے کا خدمت گذار ہو گیا ہے اور اس کا ثبوت اس طرح دیا ہے کہ فرانس میں نفسیاتی ہسپتال کے ماہرین انقلابی جذبے کو نیوراسس (نفسیاتی مرض) بتلاتے ہیں جو ان کے خیال میں سرمایہ دار طبقے کی کھلی ہوئی جانبداری ہے۔

ان آٹھ نو مخلص ماہرین نفسیات کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر انقلابی جذبہ ایک نفسیاتی مرض ہوتا تو انہیں انقلاب شکن جذبے کو بھی نفسیاتی مرض بتانا چاہئے تھا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ پال رابسن امریکی موسیقار اگر حبشیوں کی آزادی کی جد و جہد میں شریک ہونے کے سبب سے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے، تو حبشیوں کو غلام رکھنے اور جسمانی اذیت پہنچانے والے بھی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہیں۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ آئن سٹائن برٹرنڈ رسل کی امن دوستی، ایٹم بم استعمال نہ کرنے کی کوشش نیوراسس ہے تو پھر برٹرنڈ رسل کا یہ جذبہ بھی نیوراسس کا نتیجہ ہے کہ سوویٹ روس پر ایٹم بم گرانا چاہئے، بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات ہوئی۔ اصل بات تو یہ کہنی ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں، شعور کو لاشعور سے، عقل کو جذبہ سے۔ اور بیک زندگی کو نجی زندگی سے الگ کرنے کی غیر فطری ہیں۔ انسان کہیں خارج سے سماج میں داخل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ سماجی زندگی کی صورت ہی میں ظاہر ہوا اور سماجی کوششوں ہی سے ترقی کرتا رہا ہے۔

ایسی صورت میں سماجی زندگی کے مظاہر جن میں سیاسی جد و جہد، اخلاقی اور فکری تحریکیں بھی شامل ہیں۔ اس کی نجی زندگی پر کیونکر اثر انداز ہوں گی۔ ہماری نجی زندگی کے نہایت پُر رمز اور پوشیدہ لمحوں میں بھی خارجی زندگی کا سایہ لہراتا رہتا ہے۔ اگر ایک طرف ہم اپنی خواہش کے مطابق اپنے بچوں سے پیار نہیں کر پاتے ہیں، محبوبہ سے اظہار الفت نہیں کر پاتے تو دوسری طرف اپنی خواہش کے خلاف ظلم و جبر کر دیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں ہم کسی خارجی طاقت کو اپنی بہترین تمناؤں اور آرزوؤں کے درمیان حائل پاتے ہیں وہ خارجی طاقت ہمارا ماحول ہے جو بدلتا رہے نجی زندگی کا فلسفہ بنانے سے نہیں بلکہ "پبلک لائف" میں حصہ لینے اپنے دکھ درد کا مشترکہ طور سے مداوا کرنے میں

●

اسلوب کا حسن

اسلوب حقیقت کے اظہار کا صرف ایک طریقہ ہے اس کا حسن حقیقت کے پہلوؤں کو دل نشین طریقے سے اجاگر کرنے ہی میں ہے اس کا حسن اس بات میں نہیں کہ بدیہات کو پیچیدہ بنایا جائے بلکہ اس بات میں ہے کہ پیچیدہ کو سہل ممتنع کے درجہ تک پہنچایا جائے اس کا حسن اس بات میں نہیں ہے کہ لطافت احساس کو مبہم اور گنجلک بنایا جائے بلکہ اس بات میں ہے کہ اسے زور دار اور روشن کیا جائے بلکہ ذہنی ادراک میں اسے بہتر کر کے اس کی لطافت کو زیادہ پُر مایہ بنایا جائے۔

ممتاز حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ

ترقی پسند ادب کی تحریک کدھر؟

اس وقت ہماری ادبی تحریک ایک ایسی منزل میں آپہنچی ہے جہاں سے آگے بڑھنے کا کوئی صاف اور کھلا ہوا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہو رہا ہے۔

کوئی پچھلے ایک سال سے اردو ادب کے متعلق خاص طور پر پاکستان میں گرماگرم بحث چھڑی ہوئی ہے کہ ہمارے ادب پر جمود و تعطل کی کیفیت طاری ہے۔ اس میں ایک قسم کا رکاؤ یا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے وہ آگے بڑھنے کے بجائے ایک ہی جگہ پر جھٹ رہا ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

اسی طرح ہندوستان میں بعض ایسے اہم سوال ہمارے سامنے آ رہے ہیں، یکتے ہیں کہ ہماری تحریک جسے ایک بحر بیکراں ہونا چاہئے تھا محض ایک تنگ ندی بن کر رہ گئی ہے۔ جو کبھی کبھی موسم کی مناسبت سے بہت شور و شر اور تیزی کے ساتھ بہتی ہے لیکن بہت کم زمین کو اور وہ بھی صرف تھوڑے سے عرصے کے لئے سیراب کرتی ہے، تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس تحریک کو کس طرح وسیع اور مستقل بنایا جائے۔

اپنی ادبی تحریک کی موجودہ حالت پر غور کیجئے، تو ان سوالوں کی تہ میں بڑی سچائی جھلکتی ہے، یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اگر ہمارے ادب میں جمود نہیں تو سست رفتاری ضرور ہے یا جو ادبی چیزیں ان دنوں ہمارے سامنے آ رہی ہیں وہ حسن اور اثر کے لحاظ سے عموماً اونچے پائے کی نہیں ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہماری تحریک پھیلنے کے بجائے سکڑ رہی ہے لہٰذا قدرتی طور پر ہماری توجہ اس طرف جاتی ہے کہ ان اسباب کی تحقیق کی جائے جو اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں اور پھر اس کی روشنی میں وہ راستہ اختیار کیا جائے جو ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک سے جن لوگوں کا تھوڑا بہت تعلق ہے۔ ان کو تحریک کی حالت کا کم و بیش صحیح اندازہ ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے اور اب کیا کرنا چاہئے، اس بارے میں جو مباحثے ہوئے ہیں ان میں بڑا الجھاؤ معلوم ہوتا ہے اور اکثر لوگ کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچے۔ کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس تحریک کا شیرازہ نہ بکھر جائے جو پچھلی پندرہ سال کی کوششوں سے اس منزل پر پہنچی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری تحریک کی جو گت بن رہی ہے اس کی بڑی وجہ ترقی پسند ادب کی انتہا پسندی ہے۔ اس خیال کے مطابق حکمراں طبقہ کا عتاب اس تحریک پر اسی لئے نازل ہوا اور ہمارے بہت سے کم ہمت ساتھی تحریک سے کنارہ کشی کر گئے اور وہ ادیب جو براہ راست یا بالواسطہ اپنی روزی کے لئے سرکاری امداد کے رہین منت ہیں ہماری تحریک کے مخالف ہو گئے اس کے علاوہ تحریک کے مجاہدوں نے اپنے جوش ایمان کی شدت میں بعض مخلص لیکن نرم رو ساتھیوں پر ایسی لے دے کی کہ یا تو انھوں نے تحریک سے قطع تعلق کر لیا یا ادبی میدان کو چھوڑ کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھے۔ اس طرح ایک طرف تو یہ ہوا کہ تحریک کے پیرووں کی تعداد بڑھنے کے بجائے گھٹتی گئی اور دوسری طرف اس تحریک کے ماتحت جو ادب پیدا ہوا اس کی اشاعت کے ذرائع

دن بدن اور مصدد ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں یہ تحریک پنپ نہ سکی۔

ترقی پسند ادیبوں کا جو حلقہ اس تحریک کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ انتہا پسندی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک تحریک کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے۔ اس بارے میں مختلف خیالات پیش کئے جا رہے ہیں۔

ایک خیال یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک اب اتنی مرجھا گئی ہے کہ اس کے پھلنے پھولنے کا بہت کم امکان باقی رہا ہے، اس لئے اسے اپنے آپ خشک ہونے کے بجائے جڑ سے کاٹ دینا چاہئے۔ خاص طور پر ان حلقوں میں جہاں یہ بہت کمزور ہے، اور اس کی جگہ ادیبوں کی ایک نئی انجمن بنانی چاہئے۔ جس کا کوئی خاص اور واضح مسلک نہ ہو، جس میں ہر خیال اور ہر سوچ کے لوگ بیک وقت شامل ہو سکیں۔ اور وہ اپنی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ادب اور قوم کی خدمت کرنے کے لئے آزاد ہوں۔

یہ تجویز سیدھا سادہ ردعمل ہے پچھلی انتہا پسندی کا۔ میانہ روی اور رواداری اس کی روح ہے۔ اس میں یہ مفروضہ پوشیدہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کے لئے ترقی پسند ادب غیر ضروری ہے۔ یا کم از کم اسے ایک تحریک کی شکل میں فروغ دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارے ہاں ہر قسم کا ادب ہونا چاہئے، ترقی پسند بھی اور غیر ترقی پسند بھی۔ اور یہ لوگوں کے اپنے اپنے ذوق پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ کسے پسند کرتے ہیں اور کسے نہیں۔ بہرحال مختلف خیالات کے مقابلے کے لئے میدان کو وسیع بنانا چاہئے اور یہ یقین ہے کہ آخر جیت ترقی پسند ادب کی ہوگی، جس طرح کہ عقیدہ ہے کہ نیکی کی بدی پر اور سچ کی جھوٹ پر فتح ہوتی ہے۔

بظاہر یہ تجویز کچھ بے محل یا مہمل نظر نہیں آتی۔ لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو اس کا کھوکھلا پن نمایاں ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کو محض اس بنا پر ختم کرنے کا مشورہ دینا بڑی کوتاہ اندیشی ہے کہ اس پر بعض غلط اور مضر رجحانات حاوی آ گئے ہیں۔ یہ مشورہ شاید بے جگری سے دیا جا رہا ہے۔ لیکن اس میں سنجیدگی اور ذمہ داری کی کمی ہے۔ کوئی بھی تحریک جو ایمانداری کے ساتھ عوام کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ اپنی غلطی اور بے راہ روی کو درست کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے وہ کبھی مرتی نہیں اور خودکشی تو ہرگز نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں عوامی تحریکوں میں اتنا کس بل موجود ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو ختم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ تمام غلطیوں کے باوجود ہمیں اس بات پر فخر کرنا چاہئے کہ ایک طبقہ داری سماج اور نوآبادیاتی ملک میں ہمارے ہاں ادب کی ایک انجمن نے تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے جبکہ ان حالات میں ادیب روایتی طور پر انفرادیت پسند ہوتے ہیں اور وہ کسی تنظیم۔۔۔ کو بہت مشکل سے اپنے اوپر عائد کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ البتہ ہماری تحریک میں جو خامیاں پیدا ہو گئی ہیں انہیں دور کرنا اور نئے حالات کے مطابق اس کی سمت معین کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔

اب رہا ایک ایسی انجمن بنانے کا سوال جس کا کوئی مخصوص رنگ نہ ہو، کوئی واضح طرز فکر نہ ہو، سو یہ نہ تو ممکن ہی ہے اور نہ پسندیدہ۔ اگر کوئی انجمن محض نام کے لئے نہیں ہے بلکہ کچھ کام کرنا چاہتی ہے۔ تو وہ صرف اس صورت میں زندہ رہ سکتی ہے کہ اس کے اراکین کے سامنے کوئی ایسا مقصد ہو جسے پورا کرنے کے لئے وہ اس انجمن کو ضروری سمجھتے ہوں۔ ایسی تنظیم میں کوئی پائیداری نہیں ہوتی جس کے مقصد مبہم ہوں، ایسے ہوں جو لوگوں کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ بالفرض محال اگر ایسی ادبی انجمن قائم بھی ہو جائے تو وہ سماج کے لئے کچھ مفید ثابت نہ ہوگی، اس انجمن میں چونکہ ہر قسم کے عناصر شامل ہوں گے اس لئے یہاں سے اچھا اور برا دونوں قسم کا ادب نکلے گا۔ اس سے ڈر ہے کہ وہ کہیں لوگوں کی رہنمائی کرنے کے بجائے انہیں الجھن میں مبتلا نہ کر دے۔ لہٰذا ترقی پسند ادب کی تحریک کو ختم کر کے

اس کی جگہ ایک بے ڈھنگا ڈھانچا کھڑا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

دوسرا خیال جو ترقی پسند ادب کی تحریک کو ایک نیا رخ دینے کے متعلق آج کل بہت زوروں سے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اب ہمارے ہاں تمام ادیبوں کا ایک متحدہ مورچہ ہونا چاہئے۔ اس مورچہ کی کون سی شرائط ہوں۔ اور کیا مقاصد ہوں، اس بارے میں بہت سی رائے ہیں۔

بعض لوگوں کا سمجھنا ہے کہ اس متحدہ مورچہ کی شرائط اور مقاصد کو پہلے سے طے نہیں کرنا چاہئے یا کم سے کم اس میں ترقی پسند ادیبوں کو پہل نہیں کرنی چاہئے بلکہ یہ کام ملک کی دوسری ادبی انجمنوں اور مشہور ادیبوں پر چھوڑ دینا چاہئے، انھیں کسی طرح اس کام کے لئے آمادہ کرنا چاہئے۔ جب وہ آمادہ ہو جائیں تو ان کے کام میں ترقی پسند ادیبوں کو شریک ہونا چاہئے اور اس طرح جس پروگرام کی تشکیل ہو، اس پر تمام ادیبوں کو ہاں کرنی چاہئے۔

اس تجویز کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ ترقی پسند ادب میں انتہا پسندی دراصل سیاست کے راستے سے آئی ہے اسلئے اگر انتہا پسندی کے نقصانات سے ادبی تحریک کو بچانا ہے تو اسے ایک ایسی تنظیم کے ماتحت چلایا جائے جس کی کوئی واضح اور مستقل سیاست نہ ہو۔ وہ ادب کو کسی مخصوص سیاسی چال کے پرچار کا سادھن نہ بنائے بلکہ اس کا مقصد خوبصورت اور اعلیٰ ادب پیدا کرنا ہو۔ یعنی سیاست کے میدان میں اس تحریک کو غیر جانبدار ہونا چاہئے۔

اس تجویز میں بعض خطرے اور خامیاں پوشیدہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی تحریک "ادب برائے ادب" کی تنگ و تاریک گلی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے، اور اپنی غیر جانبداری کے بھیس میں ادب کو بے جان اور بے اثر بنا دے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ادب جس کا منصب زندگی کو سنوارنا اور ابھارنا ہے، رجعت پسند رخ اختیار کر لیگا۔

اصل میں سوال یہ نہیں ہے کہ ادب کو سیاست سے کس طرح محفوظ رکھا جائے کیونکہ یہ چیز ناممکن ہے ادب بہرحال نظری اور عملی دونوں لحاظ سے سیاست سے متأثر ہوتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ جو سیاست ادب پر اثر انداز ہو رہی ہے وہ کس قسم کی ہے؟ وہ ادب میں کونسی خصوصیات پیدا کر رہی ہے، ایسی خصوصیات جو انسانی زندگی کو بڑھاوا دیتی ہیں یا ایسی جو زندگی کو کھینچتی ہیں۔

ہماری ادبی تحریک کو ان سیاسی سماجی نظریوں کا سہارا لینا پڑے گا، جو ہماری زندگی میں حسن اور نکھار خوشحالی اور شادابی کے ضامن ہیں، بیشک ترقی پسند ادب کی تحریک کے لئے متحدہ مورچے کی ضرورت ہے لیکن یہ مورچہ اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکی رہنمائی کے لئے حیات پرور اصول نہ ہوں جو تمام ادیبوں کی تخلیقات کو ایک سمت دے سکیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حیات پرور اصول ہیں، جنھیں ادیبوں کے متحدہ مورچے میں بنیادی حیثیت دینی چاہئے اور جنھیں مختلف سیاسی جماعتوں سے دلچسپی رکھنے والے سبھی ادیب اپنا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اصول ملک کی ایک سیاسی جماعت کے مخصوص طرز فکر یا اس کے روز بروز بدلتے ہوئے عملی پروگرام پر منحصر نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ نوعیت کے لحاظ سے ایسے ہونگے جو ہمارے دیس کی موجودہ حالت کی صحت کے ساتھ آئینہ داری کرتے ہیں۔ لہٰذا ان اصولوں پر تمام حقیقت پسند ادیبوں کا متفق ہو جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

مگر متحدہ مورچے کے لئے مشترکہ بنیادی اصول وضع کرنے میں ہمیں ایک غلط رجحان دکھائی دیتا ہے، بعض ساتھیوں کا خیال ہے کہ یہ اصول عام قسم کے ہونے چاہئیں جو آفاقی قدروں سے عبارت ہوں، مثلاً سچائی، نیکی شرافت وغیرہ۔ ان ساتھیوں کا یہ خیال اس اندیشے پر مبنی ہے کہ اگر یہ اصول آج کی سماجی حقیقتوں کی شکل میں پیش کئے

جائیں گے تو بہت سے ادیب ان پر متفق نہ ہوسکیں گے اور کوئی متحدہ محاذ نہ بن سکے گا۔ مثال کے طور پر بعض ساتھیوں کا کہنا ہے کہ ہمیں اس بات پر بھی اصرار نہیں کرنا چاہئے کہ ہم اپنے ادب کی سامراج دشمن روایات کو آگے بڑھائیں، کیونکہ ممکن ہے ہمارے بعض ادیب محسوس کرتے ہوں کہ اب ہمیں سامراج سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ اندیشہ اپنی جگہ صحیح ہو لیکن حقیقتوں کو جھٹلا کر ادب زندگی کی خدمت نہیں کرسکتا قدریں کتنی بھی اعلیٰ ہوں ان کی جھلک زندگی میں اسی وقت نظر آئے گی جبکہ مادی حالات کی روشنی میں پرکھی جائیں۔ ادب صرف اسی صورت میں ایک موثر سماجی قوت بن سکتا ہے کہ وہ بے لاگ حقیقت کی آئینہ داری کرے۔

میرا خیال ہے کہ پچھلے تین سال میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو اتنا صدمہ سرکاری احتساب سے نہیں پہنچا ہے جتنا کہ اس بات سے کہ سماجی حقیقت سے اس کا رشتہ کمزور ہوگیا ہے۔ حکمراں طبقہ کی سختی سے تحریک کی ترقی میں رکاوٹ تو ہوسکتی تھی لیکن اس سے انتشار پیدا نہ ہوتا اگر ہمارا ادب زندگی کی ترجمانی سچائی کے ساتھ کرتا ہوتا اس لئے کہ اس صورت میں عوام کا اعتماد اور ان کی ہمدردی اور مدد حاصل ہوتی اور یہ وہ طاقت ہے جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ لیکن غلطی سے ہماری تحریک ایک ایسی سمت میں چل دی جس کے لئے ہمارے سماجی حالات ابھی سازگار نہیں تھے "ادب برائے انقلاب" کے نعرے ادبی میدان میں گونجنے لگے، سوشلزم کو قومی زندگی کی فوری منزل قرار دیا گیا، اور اسی کے مطابق ادب کی تخلیق ہونے لگی۔

یہ ادب سماجی حقیقت سے بے نیاز تھا۔ اس چیز کو نظر انداز کردیا گیا تھا کہ ہمارا دیس ابھی تک سامراج کے زیر اثر نیم جاگیری نظام کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اس لئے ان بندھنوں کو توڑنا ہمارا سب سے پہلا کام ہے اس کے بغیر کسی قسم کی خوش حالی اور ترقی کا خواب دیکھنا فضول ہے۔ ہمارا دیس آج تاریخی لحاظ سے جس منزل پر ہے اس کا تقاضا ہے کہ سامراجی اثرات سے پوری آزادی حاصل کرنے اور نیم جاگیری نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی آزادی اور جمہوریت کا حصول ہمارا فوری مقصد ہونا چاہئے، نہ کہ سوشلزم جس کی طرف ہم اس کے بعد ہی قدم اٹھا سکیں گے۔

آج ہمارے دیس میں سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ سامراج اور جاگیرداری کے اثرات ہماری قومی زندگی کو کھوکھلا کر رہے ہیں، اور ان کی وجہ سے ہماری تہذیب تباہ ہورہی ہے، سامراج ہماری مادی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہے بلکہ وہ ہماری ذہنی اور تہذیبی زندگی کو بھی اپنے آرٹ، ادب اور فلسفے کے ذریعہ زہر آلود کررہا ہے تاکہ وہ ہمارے دیس میں اپنا اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور سیاسی سازشوں کا سلسلہ بے خوف و خطر جاری رکھ سکے، اسی طرح یہاں جاگیرداری کا فرسودہ نظام ہماری زندگی کو ابھرنے نہیں دیتا، یہ قسمت پرستی اور توہم پرستی سکھاتا ہے اور یاسیت اور بے بسی کا احساس پیدا کرتا ہے، جس سے ہماری فکر و عمل کی صلاحیتیں گھٹ کر رہ گئی ہیں۔

لہٰذا ہمارے ادب کا آج سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان جاگیری اور سامراجی اثرات کے خلاف جدوجہد کرے۔ اس بنیاد پر ہی ادیبوں کا معنی خیز متحدہ محاذ بن سکتا ہے اور یہی وہ سمت ہے۔ جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو بڑھنا چاہئے۔

یہ انقلاب کچھ نہیں ہے۔ اگر بہت ہوا اور خونی انقلاب آ بھی گیا تو پھر نہ ہندو رہے گا اور نہ مسلمان ـــ صرف انسان رہے گا۔
پنڈت سندر لال

شکیل احمد علی

اس بار

(تبصرہ کیلئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

بھوک (ناول) نٹ ہمسن مترجم محمود جالندھری۔ ناشر مکتبہ شاہراہ دہلی صفحات ۲۲۹۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

نارویے کے نوبل پرائز یافتہ مصنف نٹ ہمسن (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) سے اردو داں طبقہ زیادہ ناواقف نہیں۔ محمود جالندھری نے اس کے مشہور ناول کا اردو میں ترجمہ کرکے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ بھوک میں اگرچہ ناول کے عناصر بہت کم ہیں پھر بھی اس کا انداز بیان بڑا اثر انگیز ہے جوں جوں ہم ناول پڑھتے جاتے ہیں بھوک کی شدت اور انسان کی عظمت کا احساس شدید سے شدید تر ہوجاتا ہے، بھوک کے سامنے ایک عظیم انسان کس قدر مجبور اور ناچار ہوجاتا ہے۔ یقیناً یہی کچھ کیفیت کارل مارکس کی سرمایہ لکھتے وقت ہوئی ہوگی، بھوک کے ترجمے میں محمود نے بڑی چابکدستی اور فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے اور ناول پڑھتے وقت بہت کم احساس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔ کہیں کہیں لفظی ترجمے نے عبارت میں قدرے پیچیدگی پیدا کردی ہے لیکن اس سے موضوع کے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے اور گردپوش نہ صرف دلکش بلکہ خیال آفریں ہے۔ بہتر ہوتا کہ کتاب کے شروع یا آخر میں مصنف کی سوانح حیات اور اسکے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچا دی جاتی تاکہ اردو داں طبقہ مصنف کی ذات سے بھی بخوبی واقفیت حاصل کرسکتا امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کردیا جائے گا۔

یا خدا (ناول) مصنف قدرت اللہ شہاب۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور۔ صفحات ۵۳ قیمت دو روپے

قدرت اللہ شہاب کی تصنیف یا خدا پر کافی لے دے ہوچکی ہے لیکن اس کے باوجود کتاب کے موضوع کی صداقت اور مصنف کے خلوص سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ زیر تبصرہ کتاب حسین ٹائپ میں چھپا ہوا یا خدا کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے استاد اللہ بخش نے چند صفحات پر مصور بھی کردیا ہے اردو کی مقبول کتابوں کو ٹائپ میں چھاپنے اور انہیں مصور کرنے کا یہ اقدام بڑا جرأت مندانہ اور حوصلہ افزا ہے، اردو کو سائنٹفک طریقے پر آگے بڑھانے کا صرف یہی ایک حل ہے کہ مستند مصنفین کی کتابیں اور مشہور رسالے خوبصورت ٹائپ میں طبع کئے جائیں تاکہ پڑھنے والا طبقہ اتنا عادی ہوسکے، ابھی اردو ٹائپ اور تصویروں کے نقوش کو اور بھی زیادہ حسین اور موثر بنانے کے وسیع امکانات ہیں۔ کتاب کے آخر میں ممتاز شیریں کا مقالہ جو کئی لحاظ سے مبہم بے ربط اور بحث طلب ہے اور ہماری دانست میں بے ضرورت شامل کیا گیا ہے۔

ترجمان اسرار (نظم) جسٹس شیخ عبدالرحمن ناشر مکتبہ کاروان انارکلی لاہور صفحات ۱۲۴

قیمت۔ تین روپے۔

علامہ اقبال پر بہت لوگ لکھ چکے ہیں اور ابھی بہت سے لکھیں گے۔ لیکن ایک بڑا اردو داں طبقہ اقبال کے فارسی کلام سے تقریباً بے بہرہ ہے اور بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ دی ہے کہ انکے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کیا جائے شیخ صاحب نے اسرار خودی کا منظوم ترجمہ کرکے اردو ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ ترجمان اسرار میں شیخ صاحب نے اسرار خودی کی روح اور احساس کے تاثر کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور جگہ جگہ فٹ نوٹ دیکر کتاب کی افادیت میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے۔ ترجمان اسرار میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ایک پُرمغز مقالہ بھی شامل ہے کتاب حسین ٹائپ میں چھپی ہے جس کی تزئین عبدالرحمٰن چغتائی نے کرکے کتاب کے ظاہری محاسن کو حسین و دلکش بنا دیا ہے، کاش اردو میں اس قسم کی کتابیں چھپتی رہیں تاکہ ہمارے ادبی سرمایہ میں معیاری کتابوں کا اضافہ ہوسکے۔

بادشاہت کا خاتمہ

(افسانے) مصنف سعادت حسن منٹو ناشر مکتبہ اردو لاہور صفحات ۱۹۰ قیمت تین روپیہ۔

بادشاہت کا خاتمہ منٹو کے ان گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس نے صرف چودہ روز کے قلیل عرصے میں لکھے ہیں۔ منٹو وہ پہلا باغی افسانہ نگار ہے جو سرد و گرم حالات میں بھی جمود و خیرگی کا کبھی قائل ہوا نہ انکا اور ہر قسم کے حالات میں نہایت روانی سے لکھتا رہا۔

بادشاہت کا خاتمہ میں جتنے افسانے ہیں وہ سب کے سب تو منٹو کے سابقہ معیار پر پورے نہیں اترتے لیکن اس کے باوجود اس کا اپنا رنگ ان افسانوں میں جگہ جگہ جھلکتا ہے اور چونکہ افسانے غالباً پیٹ کی ضرورت کی خاطر لکھے گئے ہیں اسلئے ہمیں منٹو سے شکایت کا کوئی حق نہیں، ہمارے ملک میں سب سے زیادہ مفلوک الحال اور بے سہارا جو طبقہ ہے وہ ادیبوں کا ہے۔ عوام کو خوشحالی اور ترقی کا راستہ دکھانیوالا ادیبوں کا یہ طبقہ بڑی کسمپرسی میں مبتلا ہے اور آزادی کے بعد بھی اس طبقہ کی بھوک اور افلاس کا کوئی حل نہ نکل سکا، اسلئے جہاں پیٹ کا سوال ہو وہاں فن اور معیار کو برقرار رکھنا بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ لیکن منٹو کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے کہ وہ ایسے حالات میں بھی اکثر زندہ اور معیاری چیزیں پیش کرتا ہے۔ کتابت و طباعت معیاری اور سرورق دلکش ہے۔

رنگ و آہنگ

(منظومات) مصنف ادیب سہارنپوری۔ سول اینڈ ملٹری تاج آفس بالمقابل میونسپل کارپوریشن بندر روڈ صفحات ۲۰۸ - قیمت تین روپے۔

بقول مولوی عبدالحق صاحب ادیب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، وہ اپنی خوش گوئی خوش فکری اور خوش اخلاقی کی وجہ سے مقبول ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ادیب سہارنپوری نوجوان شعرا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں رنگ و آہنگ انکی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور اس کی بیشتر چیزیں معیاری رسالوں میں چھپ کر خاصی مقبول ہوچکی ہیں، ابھی انکا ذوق شعری اور رنگ سخن اور نکھریگا اور یقیناً مستقبل میں وہ اس سے بھی زیادہ اچھی معیاری اور منفرد چیزیں پیش کرینگے، کتاب میں نیاز فتحپوری کا مختصر پیش لفظ، جگر مرادآبادی کا تعارف، "ادیب اور اس کا کلام" کے عنوان سے ممتاز حسن احسن کا چھوٹا سا مضمون، رشید احمد صدیقی کا ایک اور تعارف اور مولوی عبدالحق کا ایک عکسی خط جو کہ تعارف ہی ہے شامل ہیں، حالانکہ ادیب کے موجودہ مقام کو اتنی بہت سی تعارفی چیزوں کی ضرورت نہیں تھی، کتابت اور طباعت گوارا اور گردپوش جاذب توجہ ہے۔

نئے چہروں کی ضرورت

پچپن (۵۵۰۰۰) ہزار روپے کی گراں قدر پیشکش

ایم۔ ایس پروڈکشن کو اپنی زیر تخلیق تصویر کیلئے ایک ہیروئن ایک سائڈ ہیروئن ایک ہیرو ایک سائڈ ہیرو کے کرداروں کے لئے نئے چہروں کی ضرورت ہے جنکو بالترتیب پچیس (۲۵۰۰۰) ہزار۔ دس (۱۰۰۰۰) ہزار۔ پندرہ (۱۵۰۰۰) ہزار اور پانچ (۵۰۰۰) ہزار روپے بطور معاوضہ دیئے جائیں گے۔

امیدواروں کیلئے اردو کا جاننا ضروری ہے درخواستیں تین تین مختلف تصویروں اور ضروری تفصیل کے ساتھ مندرجہ ذیل پتے پر روانہ کی جائیں۔

شیخ حسن (ڈائرکٹر)

پوسٹ بکس نمبر ۱۶۰۲ کراچی ۲

...ہال فلم کارپوریشن کی لازوال اصلاحی پیشکش

جلتے دیپ

جس میں زندگی کے آنسو بھی ہیں —— مسکراہٹیں بھی!

ملک کی مشہور رقاصہ ککو کے حسین ڈانس ٹیکنیکلر میں

...وسیقی:۔ سرور ول کواتر (پوستی فیم)　　نغمات :۔ ناظم پانی پتی

...تارے: نگار ندھیر ۔ کلدیپ ۔ صوفیہ ۔ لیلا مصرا ۔ رام لال ۔ موتی لال اور دوسرے

دوتارا پکچرز کا

...قہقہوں سے بھرپور شاہکار

مڈل فیل

...الیے: کمال امروہوی ۔ کہانی: اپنونیش چندر ایم اے

ھدایت کار:۔ کشور شرما

...تارے:۔ ابوبکر ۔ راج کمار ۔ کرن ...شانتی ۔ رام مورتی ۔ بے بی زبیدہ سنگتا پرشاد اور دوسرے

ایک ماں کی حقیقت افروز اور دلگداز داستان

ہیرالال

موسیقی:۔ پرشوتم داس

گانے:۔ مہیپال

:ستارے:

ہنا ۔ پربتا دیوی ۔ چندر کانت ۔ برجھی ۔ رام اوپادھیا ۔ بھیم راؤ اور شانتا ٹھاکر وغیرہ

...حقوق تقسیم کیلئے :۔ **پاک فلم** ڈسٹری بیوٹرز ۔ کمرہ نمبر ۳ ۔ نیو اسٹینڈرڈ ہوٹل ۔ بندر روڈ کراچی

فتیا غورث

فلم کی باتیں

۱۹۵۲ء پاکستان کی فلمی صنعت کے لئے پچھلے سالوں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ سازگار ثابت ہوا ہے۔ لاہور کے بعد اب کراچی میں فلمی سرگرمیاں تیزی سے تیز تر ہو گئی ہیں۔ اسٹوڈیو کی تعمیر کے ساتھ ساتھ کچھ فلمساز اداروں نے چند تصویروں کی تیاری کا اعلان کردیا ہے۔ بعض سرگرم حضرات نے ضروری مشینری کے لئے آرڈر بھیج دیئے ہیں۔ کچھ لوگ مشینوں کی خریداری کے لئے یورپ کا سفر کرنے کا عزم کر رہے ہیں۔ اُدھر لاہور میں بیک وقت چھ سات فلمساز تصویروں کی تیاری میں شب و روز مصروف ہیں۔ فضلی کے دوپٹہ کی کامیابی نے اس امر کی نفی کردی ہے کہ پاکستان میں اچھے ہنرمندوں اور ضروری سہولتوں کا فقدان ہے۔ ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ حکومت نے بھی صنعت فلم کو گذشتہ سالوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ اہمیت دینا شروع کردیا ہے۔ کراچی میں ایک سنسر بورڈ بن گیا ہے جس پر یہاں کے فلمی پریس نے سخت احتجاج کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ سنسر بورڈ کو زیادہ نمائندہ اور زیادہ عوامی بنایا جائے۔ حکومت پاکستان کے شعبۂ فلم نے بھی پہلے کے مقابلہ میں زیادہ سرگرمی سے کام شروع کردیا ہے اور تازہ اطلاعات کے بموجب ایک فلم یونٹ ان دنوں مشرقی پاکستان کی صنعت و حرفت تہذیب و معاشرت اور تواریخی چیزوں کی فلمبندی میں مصروف ہے۔ ان حقائق کے باوجود پاکستان کی فلمی ضروریات کے لئے بھارتی فلموں کی درآمد ناگزیر ہے۔ بھارتی فلموں پر حکومت پاکستان نے بھاری ٹیکس لگا رکھے ہیں اس کے باوجود یہاں کے تقسیم کار اور نمائش کار ادارے بھارتی فلموں کی درآمد اور ان کی نمائش پر اس لئے مجبور ہیں کہ ابھی پاکستان خود کفیل نہیں ہو سکا ہے۔ جب تک یہاں کے سرمایہ دار اور حکومت اس صنعت کو بڑھاوا دینے کے لئے مالی امداد کا ضروری انتظام نہیں کرے گی، یہ صورت حال قابو سے باہر رہے گی۔ پچھلے دنوں بھارت اور پاکستان میں فلمی مفاہمت ہونے والی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے نہیں ہو سکی۔ ضرورت ہے کہ دونوں ملکوں کے نمائندے جلد از جلد اس مسئلہ پر گفتگو کرلیں اور کوئی ایسا حل ڈھونڈ نکالیں جس سے دونوں ملکوں کی فلمی صنعت اور اس صنعت سے وابستہ لاکھوں افراد کا تحفظ ہو سکے۔

لاہور اور کراچی کے تقسیم کار ادارے جو کسی نہ کسی طرح یہاں کی فلمی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں ہر طرح سے حکومت کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ ان اداروں کی بدولت ہی نئی سے نئی فلمیں پاکستان کے عوام و خواص کو دیکھنے کے لئے مل جاتی ہیں۔ لہٰذا موجودہ پابندیوں اور ٹیکس کی شرحوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ کراچی کے چند مشہور تقسیم کاروں کے پاس بھارت اور پاکستان کی جن نئی پرانی فلموں کے حقوق تقسیم ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) پاک فلم لمیٹڈ، لکشمی بلڈنگ بندر روڈ کراچی — بزدل۔ سزا۔ ساقی۔ پھولوں کے ہار۔ تماشہ، ماں۔ بازی۔ بھارت کی فلمیں ہیں اور پنجرہ اور ہرجائی

پاکستان کی فلمیں ہیں ان میں سے بازی اور ہرجائی دکھائی جا چکی ہیں، بزدل اور بادل دکھائی جا رہی ہیں۔

(۲) پاکستان فلمز۔ بندر روڈ۔ کراچی — بڑی بہو۔ خوبصورت۔ پونم۔ شعلے، ساحل۔ میٹار۔ ہمدرد۔ مادھوبالا۔ جوگن۔ آس۔ افسانہ، افسر، چمن۔ ان میں سے افسانہ، افسر، میٹار، دکھائی جا چکی ہیں، چمن دکھائی جا رہی ہے۔

(۳) کلکتہ فلم ایکسچینج۔ اوڈے رام مینشن۔ بندر روڈ۔ کراچی — گماشتہ، سرکار، اپنی عزت، سبز باغ، انجن گڈھ۔ ان میں سے انجن گڈھ اور سبز باغ دکھائی جا چکی ہیں، گماشتہ دکھائی جا رہی ہے

(۴) پاک فلم ڈسٹری بیوٹرس کمرہ ۳ نیو اسٹینڈرڈ ہوٹل بندر روڈ۔ کراچی — جلتے دیپ۔ لاہور۔ مڈل فیل۔ میرالال۔ فلم لاہور۔ کراچی کے علاوہ دوسرے شہروں میں دکھایا جا چکا ہے، یہاں کے سنسر بورڈ نے ابھی تک اس کی نمائش کی اجازت نہیں دی ہے۔

(۵) ایور ریڈی پکچرز۔ نشاط سینما۔ بندر روڈ کراچی — ہم لوگ۔ آوارہ۔ آسمان، شوخیاں موتی محل۔ ملہار۔ جھانسی کی رانی ستارہ۔ چمکی۔ راجپوت۔ خزانہ۔ رانی۔ ہنگامہ۔ گھنگھرو — ہم لوگ دکھائی جا رہی ہے۔

(۶) الائیڈ ٹریڈنگ کارپوریشن۔ بندر روڈ۔ کراچی — ہنستے آنسو۔ ترانہ۔ کالی گھٹا ہنستے آنسو۔ دکھائی جا چکی ہے ترانہ اور کالی گھٹا دکھائی جا رہی ہیں۔

(۷) فلم ایکسچینج۔ کچہری روڈ۔ کراچی — دیدار۔ سلونی اور پاکستانی فلم دوپٹہ۔ دیدار دکھائی جا رہی ہے۔

(۸) رائل فلمس۔ ۱۰۶ نیو کلاتھ مارکیٹ بندر روڈ کراچی — بیرت۔ عورت، درد دل جاگیر، بہا کی رات انسان۔ دشمنی۔ چار درویش۔

اتنی نئی فلموں کے ہوتے ہوئے بھی کراچی کے چند سینما گھروں میں دکھائی ہوئی فلمیں دوسری اور تیسری بار لگائی جاتی ہیں ہم نہیں کہہ سکتے کہ فلموں کو ایک سے زائد بار نمائش کے لئے پیش کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کے تقسیم کاروں کے پاس کافی نئی فلمیں نمائش کے لئے موجود ہیں۔ اگر اس کا مقصد طلب زر ہے تو نمائش کاروں کو سمجھ لینا چاہئے کہ پرانی فلموں کی بار بار نمائش خود ان کے حق میں مضرت رساں ثابت ہوگی۔ عوام و خواص پیسے خرچ کر کے سینما دیکھتے ہیں۔ منت نہیں، لہٰذا اس طریق کار میں فوری تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ناشر صہبا لکھنوی　　طابع مشہور آفسٹ لیتھو پریس　　دفتر کیمبل اسٹریٹ کراچی